حیدر قریشی سے لیے گئے
انٹرویز
مرتب: سعید شباب

انٹرویوز

حیدرقریشی سے لئے گئے انٹرویوز اور

حیدرقریشی کے بارے میں لئے گئے انٹرویوز

مرتب
سعید شباب

انٹرنیٹ ایڈیشن

مزید اضافوں کے ساتھ سال ۲۰۱۴

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۶۰ صفحات پر مشتمل تھا۔اب صفحہ نمبر ۱۶۱ سے لے کر صفحہ نمبر ۲۳۲ تک حیدرقریشی سے لیے گئے آٹھ نئے انٹرویوز بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔نئے انٹرویوز کرنے والوں میں عارف فرہاد، عبدالرب استاد،نسرین نقاش،معید رشیدی،محمد عاصم بٹ،عزیز نبیل،سعید الرحمٰن اور رضینہ خان شامل ہیں۔

ناشر

نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ایمسٹرڈیم۔ہالینڈ

Interviews
With Haider Qureshi
& about Haider Qureshi

کتاب : انٹرویوز

مرتب : سعید شباب

ایڈیشن اول : ۲۰۰۴ء

طابع :

سرورق: ریحانہ احمد (کینیڈا)

قیمت : ۱۰۰ روپے

ناشر: نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ایمسٹرڈیم،ہالینڈ

Nizamia Art Academy Amsterdam, Holland
NeiuwenDijk-23 (1012 LZ), Amsterdam, Holland
Ph.:020-6209123 , 6917889

☆☆**پاکستان میں تقسیم کار**☆☆

میاں محمد بخش پبلشرز محلّہ رحیم آباد۔خانپور۔۶۴۱۰۰ پاکستان

ای میل: khaliqkhanpur@yahoo.com

اور

Nayab Publications
F/183 Mohalla KhokhraaN,Khanpur-64100,Pakistan
e-mail: saeedshabab@yahoo.com

سرورق کی تصاویر (ترتیب وار): دائیں: جوگندرپال، بائیں: ڈاکٹر سعادت سعید

دائیں سے بائیں: ناصر عباس نیر، نذر خلیق، ڈاکٹر صابر آفاقی، اور سعید شباب، درمیان میں: حیدرقریشی

دائیں: فرحت نواز، بائیں: مبارکہ حیدر۔۔۔۔دائیں: سلطانہ مہر، بائیں: ثریا شہاب

دائیں سے بائیں: جواز جعفری، شعیب حیدر، اعجاز حیدر، خورشید اقبال اور احمد سہیل

دائیں سے بائیں: اختر رضا سلیمی، رضیہ اسماعیل، محمد وسیم انجم، افتخار امام صدیقی اور کاشف الہدیٰ

انتساب

پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد

(اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور)

اور

پروفیسر نذر خلیق

(گورنمنٹ ترقی تعلیم ڈگری کالج خانپور)

دونوں دوستوں کی ادب دوستی کے نام!

آپ عالم بھی ہیں، شفیقؔ بھی ہیں
آپ ادب دوست اور خلیقؔ بھی ہیں

تخلیق ہو، تحقیق ہو، تنقید ہو، کچھ ہو
اردو کے اہم شاعر و نثّار ہیں حیدر
(ناصر نظامی)

فہرست

حیدر قریشی سے لئے گئے انٹرویوز:

حیدر قریشی کے بارے میں منزہ یاسمین کے سوالنامہ کے جواب میں دیئے گئے انٹرویوز

ادبی احباب:

عزیز و اقارب:

عرضِ مرتب

میں نے چند سال پہلے حیدر قریشی کے فن پر لکھے گئے مختلف مضامین جمع کرنے شروع کئے تو بھائی نذر خلیق نے میری مدد کی۔ خاص طور پر حیدر قریشی کے بارے میں بعض پرانے اخباری تراشے ان کے ذریعے ملے۔ میں نے سوچا تھا کہ میں ان کے بارے میں ایک کتاب ترتیب دے کر چھپوالوں گا۔ جب میں نے حیدر قریشی کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا تو وہ میرا ارادہ سن کر خوش ہوئے۔ لیکن پھر میں اپنی موسیقی کے شوق میں کھو گیا اور یہ منصوبہ ادھورا پڑا رہا۔ ایک دن حیدر قریشی نے مجھے اطلاع دی کہ راولپنڈی سے وسیم انجم نے ان کے بارے میں ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس خبر سے بجائے خوشی ہونے کے اس وجہ سے افسوس ہوا کہ حیدر قریشی کے متعلق سب سے پہلے میری کتاب آنی چاہئے تھی۔ افسوس کے باوجود میں اپنے منصوبے پر کام مکمل نہ کر سکا تو پھر ایک دن حیدر قریشی کا پیغام آیا کہ جتنا میٹر جمع کیا ہے راولپنڈی میں عارف فرہاد کو بھیج دیں۔ میں نے اپنی نا اہلی کا احساس کرتے ہوئے اپنی اور بھائی نذر خلیق کی محنت سمیت سارا جمع شدہ میٹر عارف فرہاد کو بھیج دیا۔

ایک دن ہندوستان سے نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڈ بولے کی مرتب کی ہوئی بہت ہی خوبصورت سی کتاب ملی ''حیدر قریشی کا فن اور شخصیت''۔ اس بار کتاب دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور شرمندگی بھی ہوئی۔ جو کام میرے کرنے کا تھا وہ کام دوسرے دوست کئے جا رہے تھے۔ پھر نذر خلیق سے ایک تو یہ اطلاع ملی کہ اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے حیدر قریشی پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ ایک یہ اطلاع ملی کہ انہوں نے عارف فرہاد سے میٹر منگا لیا ہے اور اب وہ خود اس جمع شدہ

میٹر کو مرتب کر کے کتابی شکل میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ پھر انہوں نے ڈاکٹر شفیق احمد، پروفیسر آفاق صدیقی، ڈاکٹر سعادت سعید، جیسے دس بارہ اہم لوگوں سے نئے مضامین حاصل کئے اور انہیں کتاب کی زینت بنایا۔ جمع شدہ میٹر میں سے کئی حصے حذف کئے۔ کچھ اور اہم سیکشن بنائے اور اس طرح ''حیدر قریشی کی ادبی خدمات'' جیسی اہم کتاب مرتب کر دی۔ کتاب کے نام سے لے کر اس کی سیٹنگ کرنے تک نذر خلیق نے اتنی محنت کی کہ میں نے اس کتاب کو رشک اور شرمندگی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا۔ رشک اس لئے کہ میں ایسا کام کیوں نہیں کر سکا اور شرمندگی اس لئے کہ مجھے اس کام کو کرنے کا موقعہ ملا تھا اور میں نے اسے ضائع کر دیا۔

میری دلی خواہش تھی کہ مجھے کسی رنگ میں، کسی انداز میں سہی لیکن حیدر قریشی کے بارے کوئی کتاب مرتب کرنے کا موقعہ ملے۔ یہ خواہش اب کتاب ''انٹرویوز'' کو مرتب کر کے پوری ہو رہی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کے انٹرویوز شامل ہیں۔ ایک تو وہ انٹرویوز جو حیدر قریشی سے وقتاً فوقتاً لئے گئے۔ دوسرے وہ انٹرویوز جو اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور کی طالبہ منزہ یاسمین نے اپنے تحقیقی مقالہ کے لئے سوالنامے کے طور پر کئے تھے۔ یہ سوالنامہ حیدر قریشی کے بعض عزیز و اقارب اور ادبی دوستوں کو بھیجا گیا۔ ان کی طرف سے جو جواب موصول ہوئے ان کی ایک اہمیت ہے۔ تحقیقی مقالہ میں سارے جوابات سے استفادہ نہیں کیا جا سکا تھا۔ اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ تحقیقی ضرورت کے مطابق زیادہ اہم حصوں کو لے لیا گیا۔ اسی طرح بعض جوابات لکھے گئے اور منزہ یاسمین کو بھیج دیئے گئے لیکن قدرے تاخیر سے ملنے کی وجہ سے وہ ان جوابوں سے استفادہ نہ کر سکیں۔ لیکن ان کے سوالنامہ کی بنیاد پر جن لوگوں نے جواب لکھے تھے ان سب کی اہمیت کے پیش نظر ان سارے سوالوں اور جوابوں کو ''انٹرویوز'' کے دوسرے حصے میں شامل کر لیا ہے۔ اس لحاظ سے انٹرویوز کا یہ مجموعہ ایسے دو طرح کے انٹرویوز کی وجہ سے ایک منفرد رنگ اختیار کر گیا ہے۔

انٹرویو کا تیسرا رنگ حیدر قریشی کے وزیر آغا سے لئے ہوئے ایک انٹرویو کا اقتباس ہے جو اسی

کتاب کی جلد کی پشت پر شامل کیا جا رہا ہے۔

حیدر قریشی کے انٹرویوز سے ان کے ادبی خیالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ان کی تحریروں کے بارے میں بہتر واقفیت ہوتی ہے۔اس بارے میں ناصر عباس نیر کے سیر حاصل پیش لفظ کے بعد میرے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ان کے قریبی رشتہ داروں کے انٹرویوز سے بہت سی دلچسپ باتیں سامنے آئی ہیں لیکن میں ایک ایسی اہم بات یہاں بیان کروں گا جو ان کے رشتہ داروں میں سے کسی نے کسی رنگ میں نہیں بتائی۔جب حیدر قریشی خانپور میں تھے تب وہ اردو میں دستخط کیا کرتے تھے۔بنک اکاؤنٹ ہو یا کوئی سرکاری دستاویز، ہر جگہ انہوں نے اردو میں دستخط کئے۔میرا خیال تھا کہ جرمنی میں جا کر انہوں نے اردو میں دستخط کرنا ترک کر دیا ہوگا لیکن ایک بار میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ میں یہاں بھی ہر سرکاری یا غیر سرکاری کاغذ پر اردو میں ہی دستخط کرتا ہوں۔جرمن پاسپورٹ پر بھی اردو میں دستخط کئے ہیں۔یہ کوئی ایسی بڑی خبر نہیں ہے۔لیکن اس سے حیدر قریشی کی افتادِ طبع کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حیدر قریشی کے ایک قریبی دوست کی حیثیت سے اس کتاب ''انٹرویوز'' کو مرتب کر کے میں اپنے دل کی حسرت نکال رہا ہوں۔لہو لگا کے شہیدوں میں شامل ہونے والی بات تو یہاں نہیں کہی جا سکتی لیکن اس سے کچھ ملتی جلتی بات ضرور ہے۔مجھے امید ہے کہ حیدر قریشی کے فن کو سمجھنے کے حوالے سے اس کتاب کی ادبی اہمیت بنے گی۔

یہاں میں اپنے غائبانہ دوست اور ہالینڈ میں قیام پذیر معروف گیت کار ناصر نظامی کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اپنے ادارہ نظامیہ آرٹ اکیڈمی ایمسٹرڈیم کی طرف سے اس کتاب کی اشاعت کا ذمہ لے کر مجھے صرف سہولت ہی نہیں دی بلکہ عزت بھی بخشی ہے۔

سعید شباب

ایف/۱۸۳۔محلّہ کھوکھراں۔خانپور

پیش لفظ

حیدر قریشی کا تعلق ستر کی دہائی میں سامنے آنے والے اردو ادب کی نسل سے ہے۔اس دہائی میں اردو ادب میں جدیدیت کا غلغلہ بے حد بلند تھا۔جدیدیت بلاشبہ ہمارے یہاں مغرب سے آئی تھی، مگر مغرب میں جدیدیت کو جس طور تخلیقی، فلسفیانہ اور تنقیدی سطح پر برتا گیا تھا اور وہاں فکشن میں بالخصوص جدیدیت کے زیرِ اثر جو نمونے سامنے آئے تھے (''یولیسس'' سے لے کر ''میٹا مارفوسس'' تک) ہمارے یہاں جدیدیت کو نہ اس طور برتا جا سکا ہے اور نہ جدید فکشن میں کوئی بڑا کام سامنے آ سکا ہے، جسے جدید عالمی ادب کے سامنے اعتماد سے پیش کیا جا سکے۔ہمارے یہاں جو نام جدید فکشن کے بنیاد گذار کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ان کا فن دراصل بعض پرانی بیانیہ روایات کے احیا سے عبارت ہے۔جب کہ جدید اپنی روح کے اعتبار سے تاریخی عدم تسلسل اور ایک منفرد، یکسر نئی شناخت اور انفرادی جمالیات کی تشکیل کرتا ہے۔پرانی روایت کو نئے، عصری محاورے میں پیش کرنا جدت کہلا سکتا ہے جدید نہیں۔(جدت اور جدیدیت کے فرق کو عموماً نظر انداز کیا گیا ہے)۔دوسری طرف جن لوگوں نے جدید کا مطلب ایک یکسر نئی جمالیات کی تشکیل لیا وہ اس تخلیقی صلاحیت سے محروم تھے جو قدیم کے انہدام اور نئے کی تعمیر کے لیے ضروری ہے۔یعنی یہ انہدام تو کرتے تھے مگر ایک ایسی نئی تعمیر سے قاصر تھے جو قدیم کا متبادل ہو اور اس سے پیدا ہونے والی خالی جگہ کو پر کرتی ہو۔چناں چہ یہ لوگ اپنی ساری قوت ہئیتی سطح کے بے ثمر تجربات میں صرف کرنے لگے۔نتیجہ معلوم!

ستر کی دہائی میں آنے والی نسل کے سامنے یہ سب ہو رہا تھا۔اسے اب اپنی شناخت بنانی تھی۔ ہر نسل اپنے ابتدائی سفر میں اپنی پیش رو نسل سے اثر پذیر ہوتی،مگر پھر وہ اپنی جداگانہ شناخت کی خاطر پیش رووں کا تجزیہ اور محاسبہ کرتی ہے۔ستر کی دہائی والی نسل نے بھی اولاً جدیدیت کے اثرات قبول کیے اور بعد ازاں اس جدیدیت کا محاسبہ کیا۔محاسبے کی تحریک دراصل جدیدیوں کی بعض انتہا پسندانہ روشوں اور جدیدیت کو سطحی طور پر لینے کا ردعمل تھی۔ یہ محاسبہ کرنے والوں میں حیدر قریشی بھی شامل ہیں۔دوسرے لفظوں میں حیدر قریشی نے اپنی ادبی شناخت اپنے پیشرووں کے تخلیقی رویوں کے تجزیے کے نتیجے میں قائم کی ہے۔انہوں نے اپنے مقالات اور انٹرویوز میں متعدد مقامات پر اردو جدیدیت کے جعلی رویوں پر گرفت کی ہے۔اور یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ان کے معاصرین اپنے پیش رووں کی مانند پلاننگ کر کے نہیں لکھتے بلکہ تخلیقی انداز میں اپنے اندر کی آواز پر لکھتے ہیں۔حیدر قریشی نے جدیدیوں کے ساتھ ساتھ ان ترقی پسندوں سے بھی اپنی برات کا اعلان کیا ہے جو ادب کو ایک نعرے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔انہیں احساس ہے کہ ان کی تحریریں سماجی زندگی کے ٹھوس تجربات سے اپنا بنیادی مواد اخذ کرتی ہیں اور وہ ایک خاص مفہوم میں ترقی پسند ہیں۔مگر وہ تجربے کو اپنی روح میں حل کرنے اور پھر ایک فطری اور تخلیقی انداز سے تجربے کے اظہار کے قائل ہیں۔اس اعتبار سے ان کی بنیادی شناخت (اپنے بیشتر معاصرین کی مانند) اپنے عہد کی دو بڑی تحریکوں (جدیدیت اور ترقی پسندی) سے ہٹ کر ایک اپنا راستا اختیار کرنے میں ہے۔وہ اسے کوئی خاص نام دینے کی کوشش نہیں کرتے۔گوپی چند نارنگ صاحب اس نسل کے تخلیقی رویوں کو مابعد جدیدیت سے موسوم کرتے ہیں۔لیکن مابعد جدیدیت سے جو تصورات وابستہ ہیں وہ اس نسل کے تخلیق کردہ ادب میں بالعموم نہیں پائے جاتے۔اس نسل کی شناخت کے لیے اگر اسے کوئی نام دینا ضروری بھی ہو تو اسے ''آزاد تخلیقی رویہ'' کہنا مناسب ہے۔

حیدر قریشی کی فکر ہر چند وزیر آغا کے ادبی نظریے سے مستنیر ہوئی ہے اور اس امر کے اعتراف میں انہیں کبھی تامل نہیں ہوا،مگر انہوں نے اپنی مسلسل محنت، جاں کاہی اور ریاضت سے ایک اپنا مقام پیدا کیا ہے، اور اس کے لیے وہ کسی کے مرہونِ منت نہیں ہیں۔وزیر آغا سے انہوں نے یہ نکتہ لیا ہے کہ ادب کی تخلیق ایک بے ریا عمل ہے۔اندر کی آواز سب سے مستند ہے، اگر یہ آواز تخلیق کار کو سنائی دے رہی ہے تو اسے کسی سے سند لینے کی ضرورت نہیں۔اس نظریے کو اپنی گرہ میں باندھ کر حیدر قریشی نے جو متعدد سمتوں میں قابلِ قدر کام کیا ہے، اس پر حیدر قریشی کی انفرادیت کی مہر ثبت ہے۔

حیدر قریشی نے غزل،نظم،افسانہ،انشائیہ،خاکہ،آپ بیتی،سفرنامہ،تنقید،تحقیق لکھی ہے۔رسالہ ''جدید ادب'' کے مدیر ہیں۔اور ماہیے کے سلسلے میں ان کی خدمات اس قدر زیادہ اور اہم ہیں کہ ماہیے کے ساتھ ان کا نام اسی طرح وابستہ ہے جس طرح مثنوی کے ساتھ مولانا روم کا، مغربی انشائیے کا ساتھ مونتین کا اور اردو انشائیے کے ساتھ وزیر آغا کا۔حقیقت یہ بھی ہے کہ انہیں غیر معمولی شہرت اور اہمیت ماہیے کی وجہ سے ہی ملی ہے۔کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی دوسری حیثیتیں ثانوی ہیں یا کم اہم ہیں۔ہر گز نہیں۔شہرت انہیں پہلے بھی حاصل تھی اور ان کی شاعری اور افسانہ اہم سمجھے گئے تھے۔لیکن ان کے نام کا ڈنکا ماہیے کے فروغ کے ضمن میں ہی بجا ہے۔اور ان پر جو تنقیدی کام ہوا ہے وہ نوے کی دہائی کے بعد ہی ہوا ہے، جب ماہیے کے حوالے سے انہیں قبولیت واسترداد کے عمل سے گزرنا پڑا۔جب ماہیے کے سلسلے میں ان کی آرا کو اہم گردانا جانے لگا تو ان کے خیالات جاننے کی جستجو بھی کی جانے لگی۔غالباً جبھی ان کے انٹرویو کیے جانے لگے۔(جوگندر پال والا انٹرویو اس سے پہلے کا لگتا ہے)۔

جب کسی ادیب کے انٹرویو تواتر سے کیے جانے لگتے ہیں اور انہیں کتابی صورت میں بھی یکجا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ ادیب خصوصی اہمیت اختیار کر گیا

ہےاوراس کے خیالات وزنی سمجھے جانے لگےاوراس کی آرااہم گردانی جانے لگی ہیں۔اس کتاب میں یوں تو رسمی، غیررسمی، سرسری، مفصل ہرقسم کے انٹرویوشامل ہیں۔بعض انٹرویوایسے بھی ہیں جو دو دانشوروں کے درمیان مکالمے کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔تاہم بیشترانٹرویوز میں حیدرقریشی کی آرااورخیالات جاننے اوران کی ذاتی اورادبی زندگی سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی جستجو کی گئی ہے۔گویاان کی ذاتی اورادبی زندگی کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ انٹرویو کیے گئے ہیں۔

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا کتاب میں ہمہ قسم کے انٹرویوز شامل ہیں۔یہ تمام انٹرویوحیدر قریشی کی پوری شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔یعنی حیدرقریشی کی سوانح،ان کی ابتدائی تعلیم ،ملازمت،شادی،ادبی زندگی کا آغاز،ان کے شخصی میلانات،ان کے حلقہ احباب،ان کے مذہبی میلانات،ان کے ادبی نظریات،ان کی ادبی فتوحات،اوران کی تخلیقات کے امتیازات۔۔۔۔ سب باتوں کوان انٹرویوز کے ذریعے سے سمجھا جا سکتا ہے۔بہت سی باتیں انہوں نے خود کہی ہیں اوربعض باتیں ان کے احباب اوراعزا نے کہہ دی ہیں۔اس زاویے سے تو تمام انٹرویواچھے اور اہم ہیں،لیکن اگر انٹرویو سے مراد محض نجی اور سوانحی معلومات سے بڑھ کر دواشخاص کے درمیان ایک فکری مکالمہ لیا جائے،ایک یا چند موضوعات پر دو مشاہیر کا تبادلہ خیالات لیا جائے،ایک دوسرے کے فکری باطن کو کریدا جانا مقصود ہو تو اس کتاب میں تین ایسے انٹرویو بھی موجود ہیں۔جو جوگندر پال،اختر رضا سلیمی اورنذر خلیق نے لیے ہیں۔

ہرانٹرویومیں انٹرویو کے دونوں فریق آزمایش میں ہوتے ہیں۔انٹرویو لینے والے کی آزمایش یہ ہے کہ وہ کہاں تک سامنے بیٹھے ہوئے ہوئے شخص کی ذات کو کریدنے اوراس کے باطن کے چھپے گوشوں کو منظرِ عام پر لانے میں کامیاب ہوتا ہے اورانٹرویو دینے والے کی آزمایش یہ ہے کہ وہ سوالات کے برمحل، برجستہ جوابات دینے میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔سوائے مذکورہ تین انٹرویوز کے باقی ہرانٹرویو میں حیدرقریشی سے انٹرویو کرنے والے آزمایش میں محسوس

ہوتے ہیں۔ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ بعض انٹرویوتحریری اورانٹرنیٹ کے ذریعے لیے گئے ہیں جن میں سوال اندر سوال اٹھانے کی سہولت نہیں ہوتی۔تمام انٹرویوز میں حیدرقریشی نے جوابات برمحل،بے ساختہ،دلچسپ اور برجستہ دیے ہیں۔حیدرقریشی کے ان انٹرویوز کی ایک اورخوبی یہ ہے کہ وہ اپنے موقف کو کسی مصلحت کو ملحوظ رکھے بغیر پیش کرتے ہیں۔مثلاً وہ مغرب میں رہتے ہوئے وہاں کے اردو ادبا سے متعلق اپنے خیالات بے باکانہ انداز میں ظاہر کرتے ہیں۔یہ خیالات چشم کشا ہیں۔جو حضرات امریکا اور یورپ کو اردو کی نئی بستیاں قرار دے رہے ہیں ان کو یہ انٹرویوز ضرور پڑھنے چاہییں۔۔۔۔اوپر جن تین انٹرویوز کا ذکر ہوا ان میں حیدرقریشی کو واقعی آزمایش میں ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان سے سرسری سوالات کے جوابات نہیں طلب کے گئے، بلکہ ان سے مکالمہ کیا گیا ہے۔ان کے فکری اور تخلیقی باطن کو کھنگالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان میں حیدر قریشی نے جدیدیت، جدید افسانہ،ساختیات،اپنے نظریہ ادب،ماہیے کے فنی مسایل پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ماہیے کے سلسلے میں ان کی وضاحتوں سے کئی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔اوران انٹرویوز کی افادیت دوچند ہو جاتی ہے۔

اپنے انٹرویوز میں حیدرقریشی نے کئی اہم نکات بھی اٹھائے ہیں جن پر بحث ہو سکتی ہے۔مثلاً انہوں نے ڈاکٹر صابر آفاقی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے:''ماہیا اردو میں ایسے وقت میں مقبول ہوا جب جدید شاعری کے نام پر انتہا پسند تجربوں کے ذریعے ہمارے انتہا پسند تخلیق کاروں نے شاعری کا رشتہ معنویت کی بجائے لایعنیت سے جوڑ لیا تھا۔'' گویاان کے خیال میں جدید شاعری میں زمینی رشتوں کا احساس نہیں تھا۔ماہیا اپنی شعریات کی رو سے زمین سے مربوط ہوتا ہے۔یہ ایک خیال انگیز نکتہ ہے جس پر مزید گفتگو کی جانی چاہیے۔اسی طرح انہوں نے سلطانہ مہرکوانٹرویو دیتے ہوئے اردو میں مغرب کی طرح ناول کے فروغ نہ پانے کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے''جز میں کل کو دیکھنے کے مشرقی مزاج کے باعث ہمارے ہاں افسانہ نگاری

زیادہ مقبول ہوئی اور ناول کی طرف رجحان کم ہوا۔ناول کا انداز بنیادی طور پر مغربی مزاج سے میل کھاتا ہے۔'' یہ نقطۂ نظر بھی خیال انگیز ہے اور بحث طلب بھی!

شاید قریشی صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ناول میں جو تجزیاتی انداز اختیار کیا جاتا ہے وہ ہمارے مزاج کا اس طرح حصہ نہیں بنا جس طرح اہلِ مغرب کے ثقافتی مزاج کا حصہ ہے۔لیکن اردو میں اچھی خاصی تعداد میں ناول لکھے گئے ہیں۔اور ان میں خاصے ضخیم بھی ہیں اور معیاری بھی۔افتخار امام صدیقی کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے مابعد جدیدیت کے حوالے سے جمیل جالبی کی رائے دہرائی ہے کہ یہ یہودی سازش ہے۔یہ رائے بھی گفتگو کو دعوت دیتی ہے۔کیا علمی نظریات اور تنقیدی تصورات کے پس منظر میں سیاسی سازشیں کارفرما ہوتی ہیں؟ سوال یہ بھی ہے کہ جمیل جالبی کو آرنلڈ اور ایلیٹ تک تو سازش نظر نہیں آتی مگر بارت، دریدا، ٹیری ایگلٹن، جیمی سن وغیرہ کے یہاں سازش نظر آنے لگتی ہے۔

بہرکیف حیدر قریشی کے انٹرویوز میں متعدد ایسے نکات ظاہر ہوئے ہیں، جو قاری کو غور و فکر اور بحث مباحثے کی دعوت دیتے ہیں۔اور ایک اچھے انٹرویو کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک مخصوص شخصیت کے نقطۂ نظر کے حوالے سے قاری کے بعض سوالات کے جوابات دے تو اس کے اندر بعض نئے سوالات بھی ابھارے یا سوالات پر نئے زاویوں سے تامل کرنے پر اسے مائل کرے اور اسے فکری سطح پر متحرک کرے۔اس اعتبار سے یہ کتاب بے حد کامیاب ہے!!

ناصر عباس نیر

جھنگ، ۲۶/جولائی ۲۰۰۴

دو ملک۔۔۔دو نسلیں۔۔۔دو ادیب

جوگندر پال اور حیدر قریشی روبرو

ریڈیائی انٹرویو

جوگندر پال: حیدر قریشی نئی نسل کے نمائندہ، افسانہ نگار، نقاد اور ایڈیٹر ہیں اور نئے ادب کی روپ ریکھا میں جو ہمارے نوجوان شریک ہیں۔۔۔ ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی ---ہم نے سوچا کہ ہم ان سے بات چیت کر کے یہ طے کریں کہ ان کے ہاں کیا اپیریشنز بنتے ہیں، ادب کے تعلق سے، محبتوں کے تعلق سے---اور اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم بات چیت کر رہے ہیں حیدر قریشی سے جو اردو ادب کے ایک اہم سہ ماہی "جدید ادب" کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں، شعر کہتے ہیں، افسانے بھی لکھتے ہیں--- تو حیدر صاحب! ادھر ہم محسوس کرتے ہیں کہ جہاں ادب کے سلسلے میں اپنے فکشن میں بھی، شاعری میں بھی اور تنقید میں بھی کئی باتیں آگے بڑھی ہیں۔ فکر کا دائرہ وسیع تر ہوا ہے۔ وہاں ظاہر ہے کہ کنفیوژن بھی پیدا ہوئے ہیں۔آپ نے لوگوں کے یہاں اور نئی نسل کے یہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بھئی ہم نئے لکھنے والے لوگ ہیں۔تو اب جو نئے لکھنے والے کہتے ہیں اس سے آپ کے ذہن میں کیسی بات بنتی ہے کہ نیا کیا؟ کیا اس لئے کہ آپ نوجوان ہیں، اس لئے نئے ہیں یا آپ کے یہاں تحریروں میں بھی وہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو

مختلف ہیں اور جو اوائل میں نہیں تھیں۔ یعنی میں یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ آپ کی نئی نسل کا جو یہ تناؤ ہے نئے لکھنے والے اور پرانے لکھنے والے تو یہ نیا پن آخر ہے کیا؟

حیدر قریشی: نیا پن کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہ تو ہر دور کی حسیت اور اس عہد کا بدلتا ہوا ڈکشن جسے کہہ لیں، تو یہ نیا پن ہر دور کا اپنا نیا پن ہوتا ہے۔۔۔لیکن جو نئے لکھنے والے کہلانے کی بات ہے تو میں سمجھتا ہوں کے بظاہر ایک نیا لکھنے والا بھی پرانا ہوسکتا ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ آپ اپنے زمانے اور ماحول کے لحاظ سے آگے بڑھ رہے ہیں اور آپ کی شرکتیں بھرپور ہیں یا نہیں---ورنہ آپ اس دور میں لکھنے والے ہونے کے باوجود دو سو سال پرانے لکھنے والے بھی ہوسکتے ہیں۔

جوگندر پال: یعنی آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ کوئی پرانا لکھنے والا بھی اس اعتبار سے ---اسے بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ نئی تحریر، نیا پن ہے اس میں؟

حیدر قریشی: جی بالکل بالکل---مطلب ہے پرانا لکھنے والا اگر تازگی کے ساتھ لکھ رہا ہے اور فکری طور پر اس عہد کے ساتھ چل رہا ہے تو وہ بھی نیا لکھنے والا ہوگا۔ یہ نیا، پرانا ایج کے لحاظ سے تو نہیں ہوتا۔ یہ تو عصری آگاہی اور اس میں شرکتوں کی بات ہے۔

جوگندر پال: البتہ یہ گنجائش ہے کہ آدمی جوں جوں بڑا ہوتا چلا جاتا ہے شاید زندگی سے اس کے کٹنے کی گنجائش زیادہ بنتی ہے اور جب کٹ گیا تو عصریت سے پرے ہٹ کے شاید وہ اس قدر شدت سے نیا نہ رہے بہ نسبت اس کے جو آدمی زندگی میں شریک ہے۔ بہر حال میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ جب تک نئی زندگی میں آپ کی شرکت بنی رہے آپ کے تناؤ کے، اس دور کے تناؤ کے امکانات رہتے ہیں۔ تو آپ کے یہاں جو نئے لکھنے والے ہیں آج کل ان میں آپ کے خیال کے مطابق کون سے اہم کام ہیں اور ان کے تناؤ کے، نئی زندگی کے تناؤ کے کیا اسباب بنتے ہیں؟

حیدر قریشی: جدید افسانے کا جو تجربہ پاکستان میں ہوا وہ تقریباً ١٩٦٠ء میں انتظار حسین سے شروع ہوا۔ انتظار حسین، خالدہ حسین اور انور سجاد نے اپنے اپنے ڈھنگ سے لکھا۔ لیکن ایک مقام ایسا آیا کہ جہاں کہانی پڑھنے والا یہ محسوس کرنے لگا کہ میرے ساتھ شاید کوئی دھوکہ ہو رہا ہے یا یہ کہ کہانی اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتی چلی گئی اور کچھ یہ بھی تھا کہ کہانی پن جدید افسانے سے غائب ہوتا چلا گیا۔ میں سمجھتا ہوں اب ہمارے افسانہ نگار ایک خاص ڈھب سے کہانی کو واپس لا رہے ہیں افسانے میں---لیکن کوئی پلاننگ کر کے نہیں---جیسے انتظار کے ہاں ہے کہ وہ ایک طرف دیومالا سے استفادہ کرتے ہیں دوسری طرف کافکا کے اسٹائل کو اپناتے ہیں اور یوں اپنا افسانہ بنا لیتے ہیں---تو ان لوگوں نے اس طرح کی کوئی پلاننگ نہیں کی بلکہ تخلیقی انداز سے اپنے آپ کو دریافت کرتے ہوئے افسانہ لکھا ہے۔

جوگندر پال: انتظار کی کئی کہانیاں مجھے نجی طور پر بے حد پسند ہیں لیکن انتظار کا ایک ہی لہجے میں اپنے ہر افسانے کو برتنا---ایک ہی اسلوب لے کے چلنا--- کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کہانی کو لکھنے والا اپنے اوپر یہ حدود طاری کر لے کہ اسے ایک ہی اسلوب نبھانا ہے اور ایک طرح سے اپنے اوپر خواہ مخواہ کی پابندی عائد کر لے؟

حیدر قریشی: یہ تو کلیشے کا روپ اختیار کر جاتا ہے۔

جوگندر پال: کیا انتظار حسین کی حد تک آپ کو لگتا ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو بہت کھل کر رکھتے۔ اس امر کے باوجود کہ ان کی بعض کہانیاں اس تیکنیک میں بے حد عمدہ ہیں۔ لیکن جب یہ تکیہ کلام بن جاتا ہے کوئی تیکنیک آپ کا۔ مینرازم کی حد تک۔ تو اس سے آپ کی گنجائشیں جو ہیں، تخلیقی گنجائشیں کم تر نہیں ہو جاتیں اور کیا انتظار کے ہاں ایسا ہوا؟

حیدر قریشی: جی بالکل ایسے ہوا۔ لیکن ان کے ناول میں میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے خول سے باہر آئے ہیں۔ بستی اس لحاظ سے بڑا اہم ناول ہے کہ انتظار حسین جس مخصوص لائن پر چل رہے تھے

اس سے وہ نیچے اترے ہیں۔

جوگندر پال: حیدرصاحب! میں اپنے آپ کو یہ موقع دینا چاہ رہا ہوں۔ ان Inhabitions کے تعلق سے جو میں سمجھتا ہوں ہمارے بعض نئے لکھنے والوں کے ہاں غلط طریقے سے آ چکی ہیں یعنی تیکنیک کو اس لئے اہمیت دینا جیسے کہ تیکنیک بذات خود اہم ہے---- تو اب میرے نزدیک آپ کا چہرہ با اتفاق اس طرح نہیں جیسا وہ ہے۔ جس طرح آپ نے ساری زندگی کو بھوگا ہے---- اپنے جینز سے آپ نکلے ہیں اور ان جینز میں آپ کے والدین کی ایک دوسرے کے لئے محبت ہے اور اس کے ساتھ آپ نے جیسے زندگی کی ہے وہ ساری کاوشیں آپ کے چہرے پر یہ یا وہ لکیریں پیدا کرتی رہی ہیں۔ جس سے کہ آپ اپنی شناختیں کر پائے۔ اگر آپ کے چہرے کو تیکنیک سمجھ لیں اور آپ، آپ کی روح جو ہے وہ کہانی کے جیسی روح---- مجھے ایک بڑا بے چین سا احساس ہوتا ہے کہ ہمارے نئے لکھنے والے تیکنیک کے جبر کا شکار ہیں۔ یعنی تیکنیک کو بذات خود اہم سمجھ کے اس میں بات کو جوڑتے ہیں تو میں چاہوں گا کہ آپ ذرا کھل کر بتایئے کہ یہ کیوں ایسا ہوا ہے؟ یا ہم ہی غلط سوچتے ہیں۔

حیدر قریشی: یہ تیکنیک کی اسیری والی جو بات ہے یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان مین ایج کے لحاظ سے نئے لکھنے والے تیکنیک کی اسیری کا شکار ہیں اور پاکستان میں پرانے لکھنے والے تیکنیک کے اسیر ہیں۔

جوگندر پال: (زوردار قہقہہ)

حیدر قریشی: ہمارے نئے لکھنے والے جو وہاں پر موجود ہیں یعنی ایج کے لحاظ سے بھی جو نئے لکھنے والے ہیں وہ تیکنیک کے دباؤ سے باہر نکل آئے ہیں۔ انہوں نے انور سجاد کو فالو نہیں کیا بلکہ انہوں نے محسوس کر لیا کہ یہ کچھ کہانی کے ساتھ گڑ بڑ ہو رہی ہے۔ افسانے کے ساتھ گڑ بڑ ہو رہی ہے۔

جوگندر پال: اب یہ انور سجاد کی آپ بات کر رہے ہیں تو ظاہر ہے میں انہیں جینوئن فنکار تو مانتا ہوں یہ ظلم ہوگا کہنا کہ آپ کسی بات کا اتفاق نہ کریں تو فنکار کو ریجیکٹ کر دیں۔ جینوئن تو وہ ہے۔ اب جو انور سجاد کی آپ نے بات کی۔ اس نے " گائے" کی کہانی پیش کی۔ جس کی علامت ساری کی ساری اتنی خاموش اور سائیلنٹ ہے کہ گائے کی کہانی بھی معلوم ہوتی ہے ایک سطح پر اور دوسری سطح پر وہ کئی مظلوموں کی کہانی بھی بن جاتی ہے اور وہ گائے جس کی خاموشی میں جو ہیبت ہے وہ دنیا بھر کے مظلوموں کی ہیبت بھی ہے۔ تو میں یہ چاہتا تھا کہ انور سجاد کا یہ پیرایہ اور آگے جاتا اور گاڑھا ہوتا۔

حیدر قریشی: لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انور سجاد اس سے آگے نہیں جا سکے۔

جوگندر پال: یہ ہے۔ بعد میں انہیں شاید---- دراصل جب آپ ایک چیز لکھتے ہیں تو ایک راستے پر چلتے ہیں۔ وہ راستہ ایک حد تک راست راستہ ہوتا ہے۔ پھر آگے جا کر آپ کنفیوژن کا شکار بھی ہوتے ہیں اور وہ کنفیوژن آپ کے لئے بہتر بھی رہتا ہے۔ کیونکہ جب آپ اس کنفیوژن سے نکلتے ہیں تو ایمرج ہو کر آتے ہیں۔ یہ جو درمیان میں آ کر ان کی وہ بنیں علامتیں ۔۔۔اور علامتوں کے اندر تجرید اور تجرید کے اندر---- جیسے وہ ساری چیزیں وہ اس طرح پیش کی گئی ہیں کہ اپنی طرف اشارہ زیادہ کرواتی ہیں ----اور ہر سطح پر کہانی کار کے ساتھ پڑھنے والا جڑ جائے---- کیا ان لوگوں کے ہاں یہ کنفیوژن ہے جو بڑے بن کر بھی نکل سکتے ہیں۔ یہ موجودہ حالت میں آپ کی نسل کو قابل قبول ہے یا نہیں؟

حیدر قریشی: نہیں---- اگر تو ایسا ہے تو پھر تو قابل قبول ہے کہ جو خود کنفیوژن میں مبتلا ہے اور پورے کا پورا جتنا اپنے آپ کو ممکن ہے باہر لا رہا ہے۔ سامنے آ رہا ہے۔ لیکن اگر وہ خود تو نارمل ہے لیکن قاری کو کنفیوژن کا شکار کر رہا ہے تو میرا خیال ہے یہ کوئی اچھی بات نہیں۔

جوگندر پال: قاری بھی تو کنفیوژن کا شکار ہو سکتا ہے۔

حیدرقریشی: نہیں، ایسا نہیں ہے---- وہ خود ٹھیک ہے۔ جان بوجھ کر کنفیوژن پیدا کر رہا ہے قاری کے لئے۔خود کسی کنفیوژن کا شکار نہیں ہے۔

جوگندرپال: یعنی تیکنیکی کرتب بازی جو ہے وہ نہ ہو۔

حیدرقریشی: جی بالکل۔ یہ تیکنیکی کرتب بازی والی بات ہے۔ ادب کے ساتھ ڈرامہ بازی والی بات ہے۔

جوگندرپال: ادھر بالکل تازہ دم افسانہ نگار جو ہیں۔ بالکل نئے لکھنے والے۔ ان کے ہاں کیا چیزیں رواج پا رہی ہیں؟

حیدرقریشی: پاکستان میں؟

جوگندرپال: جی---- پاکستان میں

حیدرقریشی: موضوعات تو مختلف ہیں اور بہت ہیں ان کا احاطہ کرنا بھی ممکن نہیں اور یہاں بیان کرنا بھی شاید مناسب نہیں۔اصل چیز یہ ہے کہ وہ اپنے موضوعات کو کتنی تازہ کاری کے ساتھ برت رہے ہیں۔تو یہ جو برتاؤ ہے۔موضوع کو نبھانا جو ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے نئے لکھنے والے،نوجوان لکھنے والے بہت عمدگی کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔

جوگندرپال: اچھا---- کسی جگہ بحث ہو رہی تھی۔کسی صاحب کا کہنا تھا کہ ہم ضرورتاً علامتوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔کہانی کی نجی ضرورتوں کے تحت نہیں بلکہ خارجی ضرورتوں کے تحت۔ وہ سہولتیں میسر آجاتی ہیں ہمیں۔آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی خارجی سہولتوں سے کہانی بھرپور فن پارہ بن جائے گی؟

حیدرقریشی: دیکھیں جی۔نیا افسانہ ۱۹۶۰ء میں---- تقریباً ۱۹۶۰ء میں شروع کیا تھا انتظار نے۔۱۹۵۸ء کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا تو اس میں خارجی ضرورت کا احساس تو ہوتا ہے اور اس کا جواز بھی بنتا ہے جو صحیح تھا۔لیکن اس میں---- جب وہ جواز نہیں رہا تب بھی اسی کو دہراتے چلے

جانا۔غلط بات ہے اور اصل گڑ بڑ وہاں شروع ہوئی جب کہانی کو خارج کرنا شروع کر دیا گیا افسانے سے۔

جوگندرپال: میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ ہمارے ہاں انشائیہ کی صنف بھارت میں زیادہ نہیں پنپ پائی جبکہ پاکستان میں بڑے اچھے اچھے انشائیے آنے لگے ہیں۔تو ہمیں انشائیے کے تخلیقی سماں کے بارے میں بتلائیے؟

حیدرقریشی: انشائیے کی ابتداء کے بارے میں تو مختلف آراء ہو سکتی ہیں کہ سو سال پہلے یا ڈیڑھ سو سال پہلے اس کے ابتدائی نقوش ملے اور قدیم یونان کے لٹریچر تک بھی اس کے نشانات ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔

جوگندرپال: ہم صرف اردو کی بات کریں گے۔پاکستان کی حد تک۔

حیدرقریشی: پاکستان میں قیام پاکستان کے بعد اردو کا جو انشائیہ آیا وہ بہرحال ڈاکٹر وزیر آغا ہی کا کریڈٹ ہے اور ان کے زیر اثر جو لکھنے والے ہوئے ان میں ڈاکٹر انور سدید، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر، جمیل آذر، اکبر حمیدی، سلیم آغا، حامد برگی۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سارے لوگ ایک کارواں کی صورت بن گئے۔ پھر بہت سارے دوسری اصناف کے سینئرز کو بھی شوق دلایا گیا---- وہ لوگ بھی انشائیہ لکھنے کی طرف مائل ہوئے ان میں غلام الثقلین نقوی ہیں، شہزاد احمد ہیں خود آپ نے بھی لکھا۔

جوگندرپال: ہاں---- میں نے بھی ایک انشائیہ لکھا۔

حیدرقریشی: اور وہ بڑا بھرپور انشائیہ تھا (اے ہوش مندو!) اس پر بڑا ردعمل سامنے آیا تھا۔ قارئین نے اسے بے حد پسند کیا تھا۔

جوگندرپال: میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ جیسے یہ ہمارے طنز نگار ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ ہم بھی تو انشائیے لکھ رہے ہیں۔ میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ وہاں کے لوگوں میں جو بحثیں ہو رہی ہیں تو آپ

کن اعتبار سے انشائیے کے خدوخال کی وضاحت کرتے ہیں۔

حیدرقریشی: یہ بڑی مزیدارصورتحال ہے۔ بھارت میں انشائیے کے خدوخال کے سلسلے میں کوئی مخالفت نہیں ہورہی اس لئے یہاں انشائیہ بہت کم لکھا گیا ہے۔جبکہ ہمارے ہاں ہی اس کے خدوخال کا ساراشور ہےاور شاید اسی مخالفت کے نتیجہ میں وہاں انشائیہ زیادہ لکھا گیا۔نوجوان لکھنے والے تمام تر پروپیگنڈے کے باوجودانشائیے کے مزاج کوسمجھ رہے ہیں اور کامیاب انشائیے لکھ رہے ہیں اور جو چندلوگوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی انشائیہ نگری بنانے کی کوشش کی ہے اسے خود نوجوان انشائیہ نگاروں نے مسترد کر دیا ہے۔کوئی ان کی تقلید نہیں کرتا سوائے چندناکام انشائیہ نگاروں کے۔

جوگندرپال: اب کچھ اردوغزل کے تعلق سے، جدیداردوغزل کے تعلق سے بتائیے۔روایتی غزل اور جدیدغزل میں آپ کیوں کرفرق کرتے ہیں؟

حیدرقریشی: جدیدخلا میں تو معلق ہوتا نہیں اس کی جڑیں اپنی روایت میں ہی جڑی ہوتی ہیں اور غزل تو اپنی تمام تر جدیدیت کے باوجود اپنی روایت سے حتی کہ فارسی اور عربی غزل کی روایت سے بھی جڑی ہوئی ہے۔باقی جدیدغزل کا مطلب۔یعنی ہم اپنے عہد کے تجربات اپنے عہد کے لہجے میں غزل کے روپ میں بیان کرتے ہیں۔

جوگندرپال: میں غزل کی ہیئت کی بات جاننا چاہتا ہوں کہ اس میں کوئی تبدیلی ہورہی ہے یا نہیں؟

حیدرقریشی: جی---غزل اپنی ہیئت کے معاملہ میں خاصی حساس ہے۔

جوگندرپال: لیکن کچھ عرصہ سے آزادغزل کا چرچا بھی ہورہا ہے بہت۔

حیدرقریشی: اوہ---ہاں---آزادغزل---ہیئت میں تبدیلی،تھوڑی سی تبدیلی کا تجربہ ضرور ہے۔لیکن یہ تجربہ دیکھیں ابھی پورے طور سے مستحکم نہیں ہو پایا۔اور پھراس میں بھی آپ

دیکھیں غزل کے بنیادی تقاضے قافیہ، ردیف، بحر کی پابندی، یہ سب چیزیں ہیں صرف ارکان میں کمی بیشی ہوئی ہے---بھارت میں مظہرامام اور مناظر عاشق ہرگانوی اسے بڑھاوا دے رہے ہیں۔دلا رہے ہیں۔پاکستان میں بھی اس تجربے کوتھوڑی سی پذیرائی ملی ہے۔

جوگندرپال: اچھاحیدرقریشی صاحب! آپ اپنی کوئی غزل ہمیں سنائیے۔

حیدرقریشی: مسافتوں کی لگن تو فقط بہانہ تھا
مسافروں کو بہرحال آگے جانا تھا

جوگندرپال: واہ----

حیدرقریشی: رہا نہ دھیان کسی کو دیا بجھانا تھا
جب اس کو میں نے مجھے اس نے آزمانا تھا

جوگندرپال: اچھا ہے---

حیدرقریشی: یقین کی یہی دولت ہمارے ہاتھ آئی!!
کہ ہم نے عشق میں پیہم فریب کھانا تھا

جوگندرپال: اچھا ہے---اچھا ہے۔

حیدرقریشی: خوداپنے آپ سے احوال کہہ کے روتے رہے
کہ شہر دل کو جلانا تھا اور بجھانا تھا!

جوگندرپال: آ---خوب ہے۔

حیدرقریشی: جومیری روح میں بس زہر گھولتا ہی رہے
مرے نصیب میں چینی کا کارخانہ تھا

جوگندرپال: واہ واہ - - - - کیا بات ہے۔ دیکھئے اب یہاں آپ روایت سے منکر ہوگئے--- یہاں آ کے روایت سے منکر ہوگئے۔اور کیا عمدہ بات کہی ہے۔

حیدر قریشی: (ہنستے ہوئے) نہیں میں روایت سے منکر نہیں ہوا۔

جوگندر پال: نہیں----دیکھیں نا----

حیدر قریشی : دیکھیں جی روایت سے تو جڑا ہوا ہوں میں ---- یہ تو----

جوگندر پال: موضوعاتی اعتبار سے دیکھئے تو Every Day لائف کو جس طرح آپ نے سمو دیا ہے شعر میں۔تو بہت پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حیدر قریشی : یہ تو تجربے میں آنے کی بات ہے۔ پہلے یہ تجربہ ہی نہیں تھا۔

جوگندر پال: یہ شعر پھر سنایئے۔آہا----

حیدر قریشی: جو میری روح میں بس زہر گھولتا ہی رہے

مرے نصیب میں چینی کا کارخانہ تھا

جوگندر پال: آہاہا----

حیدر قریشی : جب آنکھیں مند گئیں حیدؔر گھنے اندھیرے میں

تو۔روشنی۔کا کوئی۔خواب۔ہی۔جگانا۔تھا

جوگندر پال: اچھا ہے---- یہ شعر بھی اچھا ہے

حیدر قریشی: مسافتوں کی لگن تو فقط بہانہ تھا

مسافروں کو بہر حال آگے جانا تھا

جوگندر پال: وقت گذرا جا رہا ہے۔ایک بات آپ سے پوچھنا چاہ رہا تھا۔آپ کے یہاں میں نے محسوس کیا کہ جو جدید اپنے آپ کو کہتے ہیں ان کو قدروں کا بھی بہت پاس ہے جبکہ قدروں کا اظہار کرنا ہمارے ہاں عام طور پر ترقی پسندوں کا خاصہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ایک تھیسس ابھر کر آیا ہے جدیدیت کا۔جس سے یہ لگتا ہے کہ Individual کے سوا کوئی بات نہیں ہے۔آپ اپنے اندر ہی اندر گھستے چلے جایئے اور قدروں کا جو پاس ہے اس سے بالکل انکار کر کے ایک تنہائی کا

منظر اور یہ آپ کی ٹرمنالوجی جو ہے ویسٹ کی۔اسے لے کے آتے ہیں۔۔۔ یہ دو باتیں مجھے اتنی الگ لگیں دونوں ملکوں میں ایک ہی زبان میں۔جدیدیت کا وہاں جو تصور ابھر کر آرہا ہے اس میں قدوروں کا پورا مفہوم ابھر کر آتا ہے اور پھر فارم کی بات کی جاتی ہے۔جبکہ ہمارے ہاں پروگریسوز جو اب ماڈی فائی کر رہے ہیں اپنے آپ کو۔ان کی ترمیم ہو رہی ہے کہ قدوروں کے ساتھ ساتھ فارم کو بھی نبھائیں۔لیکن اب تک یہ چل رہا تھا کہ پروگریسوز بولے تو زندگی کی باتیں اور فارم کا لحاظ نہیں اور جدید بولے تو فارم کی باتیں اور فارم کی سلینڈ اور قدروں کی نفی تو اس تضاد کے تعلق سے آپ جلدی سے کچھ کہنا چاہیں!

حیدر قریشی: پاکستان میں صورتحال یہ ہے کہ جو ہمارے نو ترقی پسند ادباء ہیں انہوں نے جمالیاتی قدوروں کا احساس کیا ہے۔انہوں نے محسوس کیا ہے کہ جمالیات کے بغیر بات نہیں بنے گی۔محض زندگی کے نعروں سے کام نہیں چلے گا۔

جوگندر پال: ایسے لوگ جو ہیں۔ظاہر ہے تنقید بھی بہت لکھی جا رہی ہو گی تو ان میں کون سے نام ہیں؟

حیدر قریشی: رشید امجد ہیں

جوگندر پال: پاکستانی تنقید نگاروں کے بارے میں کچھ بتایئے؟

حیدر قریشی: ڈاکٹر وزیر آغا بہت بڑے نقاد ہیں ہمارے ادب کے۔وہ ادب کو بڑے وسیع تر تناظر میں دیکھتے ہیں۔پھر ڈاکٹر انور سدید ہیں جیلانی کامران ہیں کچھ اور نام بھی ہیں۔

جوگندر پال: یہاں کے تعلق سے جو آپ دیکھتے ہیں تو آپ کو یہ احساس ہوتا ہے آپ ان دو چار روز میں یہاں کے ادیبوں سے بھی ملے ہیں اور یہاں کا ادب بھی آپ تک پہنچا ہے۔یہاں کی جو تنقید ہے یہ جو دو خانے بنے ہوئے ہیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وقت آ گیا ہے کہ اب خانوں کے لحاظ سے اٹھ کے زندگی کو تلاشا جائے؟

حیدر قریشی: جی نہیں یہ خانے تو رہیں گے۔ ہاں---- ہندوستان کی تنقید میں خاصی کمی محسوس ہوتی ہے اس کے لئے یہاں کے اچھے تخلیق کاروں کو تنقید کی طرف بھی آگے آنا چاہیے۔

جوگندر پال: اچھا حیدر قریشی صاحب شکریہ۔ ہم نے یہ وقت آپ سے بھاگ دوڑ میں نوچ کے لے لیا۔

حیدر قریشی: جی آپ کا بھی شکریہ۔

جوگندر پال: آپ نے ہمیں بڑی واقفیت پہنچائی۔ شکریہ۔

☆☆☆

(آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے ۱۹۸۷ء کے وسط کی کسی تاریخ میں نشر ہوا)

حیدر قریشی سے انٹرویو

پروفیسر ڈاکٹر صابر آفاقی (مظفر آباد۔کشمیر)

(**نوٹ**: پروفیسر ڈاکٹر صابر آفاقی ۲۰۰۰ء میں جرمنی گئے تھے۔ وہاں انہوں نے حیدر قریشی سے ایک انٹرویو کیا تھا۔ انٹرویو مئی/۲۰۰۰ء میں لیا گیا تھا۔)

سوال: آپ کا بچپن کہاں اور کیسے گزرا؟ وہاں کی کوئی یادیں؟

جواب: میرے بچپن اور لڑکپن کا بیشتر حصہ رحیم یار خاں اور خان پور میں گزرا۔ چونکہ شروع میں ہمارا گھر خوشحال تھا اس لئے ابتدائی عرصہ تو بہت اچھا گزرا لیکن جب ابا جی کا کپڑے کا کاروبار زوال کا شکار ہوا تو ہماری تکالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم نے تنگ دستی کا ایک طویل زمانہ کاٹا۔ اس کے باوجود بچپن ویسے ہی گزرا جیسے میرے معاشرے کے عام بچوں کا گزرتا ہے۔ یادیں تو بے شمار ہیں۔ انڈیا کے ادبی رسالہ ''گلبن'' احمد آباد میں میری یادیں قسط وار چھپ رہی ہیں۔ اب تک سات قسطیں چھپ چکی ہیں۔ میں ان یادوں کو اپنے ادبی رسالہ ''جدید ادب'' میں بھی چھاپنا شروع کر رہا ہوں۔ سو ان یادوں کو یا تو ان رسائل میں دیکھا جائے یا پھر میری کتاب ''کھٹی میٹھی یادیں'' کے چھپنے کا انتظار کر لیں' کیونکہ ان یادوں کے بیان کے لئے تو آپ

کے اس پورے انٹرویو کے صفحات ناکافی ہوں گے۔

سوال: ایبٹ آباد میں ملازمت اور قیام کا تجربہ کیسا رہا تھا؟

جواب: بے حد خوبصورت اور بے حد خوشگوار۔۔۔۔۔ایک تو مجھے ایک لمبے عرصہ کی بے روزگاری کے بعد ملازمت ملی تھی‘ پھر ملازمت درس وتدریس کی تھی۔جس ادارہ میں جاب ملی وہ ایک مستحکم ادارہ تھا۔پاکستان میں اس ملازمت کے بعد مجھے پہلی دفعہ آرام دہ زندگی کا احساس ہوا تھا۔میں آج بھی اس تعلیمی ادارہ کے سربراہ اعجاز اکبر صاحب کو دعائیں دیتا ہوں۔پھر صحرائی علاقہ کے بعد پہاڑی علاقے کے مظاہر فطرت سے میری شناسائی ہوئی۔اس کے اچھے اثرات میری تخلیقات پر مرتب ہوئے۔

سوال: جرمنی میں زندگی کیسے گزر رہی ہے؟

جواب: اللہ کا کرم ہے۔یہاں آنے کے بعد جب زندگی کے بعض تفکرات سے چھٹکارا ملا تو مجھے بہتر طور پر ادبی اور تخلیقی کام کرنے کا موقعہ مل رہا ہے۔اور سارے کام کرنے کا مزہ بھی آرہا ہے۔”جدید ادب“ کو اب پھر سے ریگولر کرنے کا سوچ رہا ہوں۔تخلیقی طور پر فعال ہوا ہوں۔گزشتہ چھ برس کے عرصہ میں میرے تین شعری مجموعے‘ایک مجموعہ خاکوں کا‘ایک افسانوں کا‘چھپ چکے ہیں۔تحقیق اور تنقید کی چار کتابیں چھپ چکی ہیں۔مزید اس وقت تنقید کی دو‘انشائیوں کی ایک‘ایک سفرنامہ‘کوئی چار پانچ کتابیں زیرِ اشاعت ہیں اور دو تین زیرِ ترتیب ہیں۔میں مذاق میں کہا کرتا ہوں کہ جرمنی میں میری جاب اور میری فیملی میرے لئے ”پارٹ ٹائم“ ہیں جبکہ ادب میرے لئے فُل ٹائم ہے۔لیکن کبھی کبھی ایسے لگتا ہے جیسے یہ بات محض مذاق نہیں‘واقعی سچ ہے۔بہر حال زندگی یہاں مزے مزے سے گزر رہی ہے۔

سوال: جرمنی میں آنے کے بعد آپ کی غزل میں کس قدر تبدیلی آئی ہے؟

جواب: ایک دوست نے مجھے لکھا کہ جرمنی جانے کے بعد آپ کی غزل میں اظہار بہت زیادہ

کھلا ڈُلا ہو گیا ہے۔بات ان کی درست تھی۔ہجر کے لمبے زمانے کے بعد وصل کا موسم آئے تو اس کا اثر تو ظاہر ہوگا۔لیکن یہ بھی ہے کہ میری ابتدائی غزلوں میں بھی ایسے اشعار موجود تھے:

یہ میرے جسم پہ کیسا خمار چھایا ہے۔۔۔۔۔تمہارے جسم میں شامل مجھے شراب لگے

رات بھر وصل کا چاند چمکا کیا۔۔۔۔دل سمندر ہمکتے رہے رات بھر

تمہارے ہی لئے ہیں دل کے جتنے مل سکیں ٹکڑے۔۔۔تمہارے واسطے ہے تن پہ جتنا ماس باقی ہے

اور یہاں جرمنی آنے کے بعد میری غزل میں ایسے اشعار بھی ہوئے ہیں:

یہ آنکھ کے آنسو ہیں کہ ساون کی جھڑی ہے۔۔۔۔قابو میں نہیں دل کہ حضوری کی گھڑی ہے

آج تو کھل کے ہنس دیئے حیدرؔ۔۔۔۔۔دل کے زخموں کے جتنے ٹانکے تھے

جب اس نے خاک اڑانے کا ارادہ کر لیا ہے۔۔۔۔۔تو ہم نے دل کے صحرا کو کشادہ کر لیا ہے

جرمن احسانات سبھی برحق حیدرؔ۔۔۔۔۔فیض مگر کچھ اور ہی دھرتی ماں کے تھے

آج حیدرؔ موڈ ہی کچھ اور تھا۔۔۔۔۔سو غزل میں استخارہ کر لیا

اس کے باوجود بہر حال یورپ کے ماحول کی کشادگی کا اثر تو غزل پر آنا تھا سو آیا‘لیکن صرف غزل پر ہی کیوں؟ اس کے اثرات تو میری ساری تخلیقات میں ہوں گے۔

سوال: اردو ماہیا کے حوالے سے آپ اب سند کا مقام رکھتے ہیں‘اردو ماہیے کی بعض خصوصیات بتائیں گے؟

جواب: اردو ماہیے کی بنیادی خصوصیات تو وہی ہیں جو پنجابی ماہیے کی ہیں تاہم جب کوئی تجربہ وسعت اختیار کرتا ہے تو اس میں بہت سا ”کچھ اور“ بھی آجاتا ہے۔ایک اہم ترین خصوصیت ماہیے کی یہ ہے کہ یہ تخلیق کار کو خلا سے اتار کر زمین پر لاتا ہے۔ماہیے میں زندگی اور دھرتی سے گہری وابستگی ہے۔پھر اس میں ژولیدہ ابہام گوئی کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔یوں مجھے لگتا ہے کہ اپنی ان دو خصوصیات کے باعث ماہیا‘اردو میں ایسے وقت میں مقبول ہوا جب جدید شاعری کے نام پر

انتہا پسند تجربوں کے ذریعے ہمارے انتہا پسند تخلیق کاروں نے شاعری کا رشتہ معنویت کی بجائے لا یعنیت سے جوڑ لیا تھا۔ادب دھرتی سے کٹ کر خلا میں معلق سا ہو گیا تھا۔ایسے حالات میں ماہیے نے نہ صرف اپنی دھرتی کی اہمیت کا احساس دلایا ہے بلکہ بامعنی تخلیق کے لئے لفظ و معنی کے ہم رشتہ ہونے کی ضرورت کا احساس بھی دلایا ہے۔سو ماہیے کی یہ ایسی خصوصیات ہیں جن سے ماہیے کی اپنی پہچان تو ہے‘سو ہے۔۔۔خود ماہیے کے ذریعے سے انتہا پسند جدیدیت کو بھی اعتدال کی راہ دکھائی گئی ہے۔

سوال: آپ کے نزدیک ماہیے کا مستقبل کیا ہے؟

جواب:اگر دس سال پہلے کی صورتحال سامنے رکھوں اور پھر آج ماہیے کی مقبولیت دیکھوں تو ماہیے کا مستقبل بے حد درخشاں دکھائی دیتا ہے۔تاہم اس کا درست فیصلہ بہر حال آنے والا وقت کرے گا۔اس وقت تین سو کے لگ بھگ ماہیا نگار ہیں اور اس کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔پاکستان‘یورپ اور انڈیا سے مجموعی طور پر بیس سے زائد ماہیے کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔علمی لحاظ سے بحث مباحثہ کی صورتحال اہلِ ادب کے سامنے ہے۔

سوال: دیارِ مغرب میں شعروادب کی صورتحال کیسی ہے؟

جواب:ادب کی دو لائنیں ہمارے پورے ادبی منظر میں موجود ہیں۔ایک تخلیقی اور اکیڈمک لائن اور دوسری شو بزنس کی لائن۔مغربی ممالک کے بیشتر شعراء ادب کی شو بز لائن سے تعلق رکھتے ہیں۔مشاعرہ بازی‘کتابوں کی رونمائیاں اور ریڈیو ٹی وی کے پروگرام اسی لائن کی چیزیں ہیں۔ویسے کبھی کبھار اس لائن میں کوئی اچھی چیز بھی آجاتی ہے۔دوسری اکیڈمک اور تخلیقی لائن ہے۔اس میں ہمارے ہاں بہت کم لوگ ہیں۔ڈاکٹر گیان چند جین‘ڈاکٹر ستیہ پال آنند‘شان الحق حقی‘ساقی فاروقی‘ہرچرن چاولہ‘جیسے لوگ اس زمرہ میں آتے ہیں۔یہاں کے لوگوں کا بنیادی مسئلہ ادب نہیں بلکہ وطن کی اداسی ہے۔سو اسی یادِ وطن میں لکھ لکھا (’’لکھ‘‘ کم اور’’ لکھا

’’زیادہ) لیتے ہیں۔اور خود ہی اپنے اعزاز میں تقریبات کرا کے خوش ہو لیتے ہیں۔یہاں مشاعروں میں ایک تہائی سے زیادہ شعراء دھڑلے سے بے وزن کلام سناتے ہیں اور داد پاتے ہیں۔اسی سے ادب کی صورتحال کا اندازہ کر لیں۔بعض شعراء اور شاعرات بے وزن شاعری کے مجموعے بھی چھپوا لیتے ہیں اور بعد میں انہیں چھپاتے پھرتے ہیں۔ویسے وہ گروہ ان سب سے بازی لے گیا ہے جو ایک مصرعہ لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا لیکن نقد ادائیگی کے نتیجہ میں اپنے نام سے پورا شعری مجموعہ چھپوا لیتا ہے اور اسی پیسے کے بل پر بھرپور تقریبات کا اہتمام بھی کر لیتا ہے۔مالی رشوت کے ساتھ بعض شاعرات کے معاملہ میں جمالی رشوت کے چرچے بھی سننے میں آرہے ہیں۔

سوال: دیارِ مغرب میں اردو صحافت کا کیا حال ہے؟

جواب:امریکہ سے ایک اچھا ادبی رسالہ’’آواز‘‘ نکلتا ہے۔انگلینڈ سے’’سفیرِ اردو‘‘اور ’’صدا‘‘ نکلتے ہیں۔ڈنمارک سے سماجی اور ادبی رسالہ’’شاہین‘‘ نکلتا رہا ہے۔بیچ میں بند ہو گیا تھا اب پھر اس کا اجرا ہو رہا ہے۔ڈیلی جنگ لندن اور ویکلی راوی بریڈ فورڈ کے ادبی صفحات چھپتے ہیں۔جرمنی سے اردو دنیا جاری ہوا ہے۔ارشاد ہاشمی اور جاوید خان اسے مسلسل ماہنامہ کے طور پر نکال رہے ہیں۔غالباً یہ پہلا ادبی خبرنامہ ہے جس نے پوری اردو دنیا میں تحرک پیدا کیا ہے۔میں نے بھی جرمنی سے’’جدید ادب‘‘ شروع کیا ہے۔یہ تو ان رسائل اور اخبارات کا ذکر ہے جو میری نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ہو سکتا ہے ان کے علاوہ بھی بعض رسائل ہوں جو میرے علم میں نہ ہوں یا مجھے اس وقت یاد نہ آرہے ہوں۔

سوال: آپ زندگی کا مقصد کیا سمجھتے ہیں؟

جواب: میں ابھی تک زندگی کے بھید کو ہی نہیں سمجھ پایا‘اس کے مقصد کو کیسے سمجھ پاؤں!

سوال: مذہب کی آپ کے نزدیک کیا اہمیت ہے؟

جواب: میرے نزدیک مذہب کے دو رُخ ہیں۔ایک عقائد اور فروعات سے متعلق اور دوسرا بندے اور خدا کے تعلق سے متعلق۔ پہلا رُخ تو ایسا ہے کہ یہ ہر انسان کے اپنے ذہن اور سوچ کی حد تک ہوتا ہے۔یار لوگ اسی بات پر لڑنے مرنے پر تُل گئے کہ حضرت آدم کی ناف تھی یا نہیں تھی؟ اور کوّا حلال ہے یا حرام؟ سو فروعات والے رُخ کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔البتہ بندے اور خدا کے تعلق کے حوالے سے میرا خیال ہے کہ ہر بندے کی خدا سے تعلق کی اپنی ہی نوعیت ہوتی ہے۔وہ ہر کسی پر اس کی توفیق اور طلب کے مطابق ظاہر یا منکشف ہوتا ہے۔اسے آپ مذہب کا روحانی پہلو کہہ سکتے ہیں۔مجھے اس پہلو سے گہری دلچسپی ہے۔۔اسی لئے تصوف سے میری رغبت مزید بڑھ گئی ہے۔میں رُوح کی بالیدگی اور ترفع کے لئے روحانیت کی بہت زیادہ اہمیت کا قائل ہوں۔

سوال: شعر و ادب کے حوالے سے آپ کا آئندہ کا کیا پروگرام ہے؟

جواب: ابھی تک جتنا کام ہوا ہے، خدا کے فضل اور اسی کی دی ہوئی توفیق سے ہوا ہے اور آئندہ بھی جو ہوگا اسی کی دی ہوئی توفیق سے اور اسی کے فضل و کرم سے ہوگا۔مجھ گنہگار پر اس کے بڑے ہی فضل اور کرم ہیں۔میں تو بس شکر گزاری کی تھوڑی سی کوشش کر لیتا ہوں اور وہ مجھے سرشار کر دیتا ہے۔

سوال: اپنا کوئی تازہ کلام تھوڑا سا سنائیے گا؟

جواب: ایک تازہ ماہیا ہے:

یوں روشن جان ہوئی
دل میں کہیں جیسے
مغرب کی اذان ہوئی

اور تازہ غزلوں کے چند شعر ہیں:

ایک خوشخط سے شخص نے حیدؔر
ہم کو بھی خوش خیال کر ڈالا

آسیب بنے بیٹھے تھے مدت سے جو دل میں
خود اس نے نکالے وہی ڈر، اور مکمل
ہو جائے نہ مغرور کہیں اور وہ حیدؔر
اب اس سے کرو صرفِ نظر، اور مکمل

درختوں پر پرندے لَوٹ آنا چاہتے ہیں
خزاں رُت کا گزر جانا ضروری ہو گیا ہے
اندھیرا اس قدر گہرا گیا ہے دل کے اندر
کوئی سورج اُبھر جانا ضروری ہو گیا ہے

☆☆☆

مطبوعہ: ☆سہ ماہی **ادبِ عالیہ** وہاڑی۔پاکستان شمارہ اپریل تا جون ۲۰۰۲ء
مدیران ریاض ہانس، ریاض ملک
☆**حیدر قریشی کا فن اور شخصیت** مرتبین نذیر فتح پوری، سنجئے گوڑ بولے
ناشر اسباق پبلی کیشنز۔پونہ، انڈیا۔(اپریل ۲۰۰۲ء)

بیس سوالوں کے جواب

سوالات: سلطانہ مہر (امریکہ)

جواب: حیدر قریشی (جرمنی)

(یہ تحریری انٹرویو سلطانہ مہر نے اپنی کتاب ''سخنور'' جلد سوم کے لئے ایک سوالنامہ کی صورت میں لیا تھا۔ مذکورہ کتاب میں ضرورت کے مطابق جواب شامل کئے گئے ہیں۔ یہاں سوالنامہ کے مکمل جواب درج کئے جارہے ہیں)

سوال نمبر ۱: آپ کا پورا نام اور تخلص؟

جواب: میرا پورا نام قریشی غلام حیدر ارشد ہے۔ میں نے ارشد تخلص کو شاعری میں استعمال کرنے کی بجائے اپنا قلمی نام حیدر قریشی اختیار کرلیا۔

سوال نمبر ۲: سن تاریخ وجائے پیدائش؟

جواب: سرکاری کاغذات کے مطابق یکم ستمبر 1953ء لیکن حقیقتاً 13 جنوری 1952ء ہے۔ پیدائش ضلع جھنگ کے ایک چھوٹے سے شہر ربوہ میں ہوئی جہاں میری والدہ اپنے میکے آئی ہوئی تھیں تاہم میرا آبائی علاقہ خانپور اور رحیم یار خاں ہے۔

سوال نمبر ۳: حصول تعلیم اور ملازمت کی تفصیل؟

جواب: 1968ء میں گورنمنٹ ہائی سکول خانپور سے دسویں کا امتحان پاس کیا اسی برس (16 سال کی عمر میں) حئی سنز شوگر ملز خانپور میں مزدوری کر لی۔ ایک ہفتہ صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک ڈیوٹی ہوتی۔ ایک ہفتہ شام چھ بجے سے رات دو بجے تک ڈیوٹی ہوتی اور ایک ہفتہ رات دو بجے سے صبح دس بجے تک ڈیوٹی ہوتی۔ شروع میں 78 روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔ سیزنل ملازمت تھی چھ مہینے نوکری، چھ مہینے بیکاری، 1970ء میں میں نے پرائیویٹ طور پر ایف۔اے کا امتحان دیا اور پاس ہوگیا۔ 1971ء میں میری شادی کردی گئی۔۔۔ 1972ء میں بی۔اے کا امتحان دیا اور کامیاب ہوا۔ اسی برس ایک بیٹی کا باپ بھی بن گیا۔ 1974ء کا ایم۔اے کا سالانہ امتحان 1975ء میں منعقد ہوا میں نے اس میں بھی پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے شرکت کی اور کامیاب ہوگیا۔ میرا مضمون اردو تھا۔۔۔ 1974ء میں ایک اور بچے کا باپ بھی بنا۔ اس برس میرا پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ 1975ء میں تیسرا بچہ اور دوسرا بیٹا پیدا ہوا۔ اسی عرصہ میں مجھے شوگر ملز میں تھوڑی سی ترقی بھی عطا کی گئی اور پرمانٹ بھی کر دیا گیا۔ میں نے تقریباً انیس برس اُس شوگر مل کی نوکری کر کے برباد کئے۔ شفٹ کیمسٹ تک مجھے ترقی دی گئی لیکن یہ ترقی میرے لیے خوشی کی بجائے شرمندگی کا موجب بنا دی گئی۔ کسی دوسری مناسب ملازمت کے لیے متعدد بار کوشش کی لیکن کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ 1987ء میں کوئی نئی ملازمت حاصل کیے بغیر شوگر مل کی نوکری چھوڑ دی۔۔۔ تین سال بے روزگاری کے مزے لُوٹے اور "تماشائے اہل کرم" دیکھا۔ 80ہزار روپے کا مقروض ہوگیا تو ایبٹ آباد کے ایک معیاری تعلیمی ادارہ میں اردو پڑھانے کی اچھی نوکری مل گئی۔ یہ 1990ء کی بات ہے۔ 1992ء میں بوجوہ وطنِ عزیز کو خیرباد کہنا پڑا۔

سوال نمبر ۴: آپ کا قیام کہاں کہاں رہا؟

جواب: اس سوال کا جواب اوپر آ گیا ہے۔ مختصراً یوں ہے کہ ابتدائی بچپن رحیم یار خان میں بسر

ہوا۔ پھر دو برس ربوہ میں۔ اس کے بعد زندگی کا بیشتر حصہ خانپور میں بسر ہوا۔ خانپور کی نوکری کے بعد ایبٹ آباد میں ملازمت کی اور اب جرمنی میں مقیم ہوں۔

سوال نمبر ۵: شاعری کے علاوہ ادب کی اور کون سی صنف سے وابستگی ہے؟

جواب: بنیادی وابستگی تو ادب سے ہے۔ شاعری پہلی محبت ہے ویسے میں نے افسانے بھی لکھے ہیں خاکے بھی لکھے ہیں۔ انشائیے بھی تھوڑے بہت لکھے ہیں۔ باقاعدہ قسم کا نقاد تو نہیں ہوں تاہم اپنی ذاتی رائے کو مختلف مضامین میں بیان کیا ہے تو دو تنقیدی کتابوں جتنے مضامین بھی لکھ ہی چکا ہوں۔

سوال ٦: ادب اور شاعری سے وابستگی کے بنیادی محرکات کیا تھے۔؟

جواب: میں اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔ تاہم میری زندگی کے ابتدائی ایام ایک متوسط گھرانے کی متوسط خوشحالی کے ایام تھے۔ ابا جی کا کپڑے کا بزنس خراب ہوا تو ہم لوگ بھیانک غربت کی زد میں آ گئے۔۔ سو کم عمری میں پڑھائی چھوڑ کر نوکری کر لی تا کہ ابا جی کا بوجھ بٹا سکوں۔ ہر چند خدا کے فضل سے پرائیویٹ طور پر اپنی پڑھائی بھی مکمل کر لی، لیکن معاشرتی ناانصافیو ں اور زیادتیوں نے میری روح میں بے شمار گھاؤ پیدا کیئے۔ ممکن ہے زندگی کا یہ سارا کھیل تماشہ ادب سے میری وابستگی کا محرک رہا ہو۔ یہاں دو دلچسپ باتیں بتاتا چلوں۔ بچپن میں سنا کرتے تھے کہ میرے چھوٹے ماموں حبیب اللہ صادق صاحب (حال مقیم امریکہ) شاعر ہیں۔ ان کی شا عری تو ہماری جوانی سے پہلے ہی ختم ہو گئی لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں بچپن میں ماموں صا دق کو ہمیشہ حیرت اور خوشی کے ساتھ دیکھا کرتا تھا اور اس بات پر خوش ہوتا تھا کہ میرے ایک ما موں شاعر ہیں۔ دوسری بات یہ کہ میری شادی 1971ء میں ہوئی اور اسی برس میری شاعری کا آغا ز ہوا۔ اب بنیادی محرکات کو آپ خود ہی ڈھونڈتی رہیے۔

سوال نمبر ۷: شعر گوئی کے لیے کونسی کیفیت یا جذبہ آپ کے لیے سب سے بڑا محرک

ہوتا ہے؟

جواب: عام سے دکھ یا نارمل سی خوشی سے بڑھ کر کوئی بھی دکھ یا خوشی کی کیفیت مجھے اس طرف مائل کر دیتی ہے تاہم اس کے لئے مجھے ہمیشہ اپنے اندر کی آواز کا انتظار رہتا ہے۔ مناظر و مظاہر فطرت سے میں بیگانہ نہیں رہ سکتا اسی لئے دیہاتی ماحول کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ آپ مجھے "پینڈو ادیب" کہیں تو مجھے شرمندگی نہیں ہوگی خوشی ہوگی۔ محبت کا جذبہ میرے لیے لکھنے کا سب سے بڑا محرک ہوتا ہے۔ لیکن یہ عام سطحی محبت کی بات نہیں ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے میرے خاکوں کے مجموعہ "میری محبتیں" کو میرے دونوں شعری مجموعوں "سلگتے خواب" اور "عمر گریزاں" کے سا تھ ملا کر پڑھیئے۔

سوال نمبر ۸: کس مکتبۂ فکر سے آپ کی شاعری متاثر ہے، کیا ادب اور شاعری کو نظریاتی ہونا چاہیے؟ آپ کس نظریے کے تحت شعر کہتے ہیں؟

جواب: میں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ کسی بھی نظریے کے تحت شعر نہیں کہتا اور نہ ہی ایسی شاعری کو اچھی شاعری سمجھتا ہوں جو پہلے نظریے کی پابندی کرائے اور پھر اس کے مطابق شاعری کرائے۔ ہر شاعر زندگی کے مختلف نظریات میں سے کسی نہ کسی کا معترف ضرور ہوتا ہے سو اس کا نظریہ اس کی روح کا جزو بن کر جب اس کے اندر سے آتا ہے تو اعلیٰ فن پارہ بن جاتا ہے لیکن جب محض کسی عقیدے کا اظہار مقصود ہو اور شاعری ثانوی حیثیت اختیار کر جائے تب پراپیگنڈا شاعری تو وجود میں آ جاتی ہے اچھی شاعری نہیں۔ آپ اردو ادب میں ہندو مسلم اور سکھ ادیبوں کے بڑے نام دیکھ لیں مختلف عقائد اور نظریات کے باوجود ان سب نے بڑا ادب تخلیق کیا ہے کوئی ادیب کسی بھی نظریہ کو ماننے والا ہو، لمحۂ تخلیق میں وہ اپنے باہر سے آزاد ہو کر اپنے اندر کی آواز پر لکھتا ہے تو اس کے اندر کے نظریے سے اپنے اختلاف کے باوجود میں اسے بڑا ادیب سمجھوں گا۔ میں نے جتنے مختلف قسم کے ادبی نظریات کو پڑھا ہے ان کے کچھ نہ کچھ اثرات تو ضرور مرتسم ہوئے ہیں میں

نے ایک مزدور اور محنت کش کی زندگی گزاری ہے اس کے اثرات بھی ہیں۔ روحانیت سے مجھے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے سو تصوف کے اثرات بھی ہیں لیکن میرے نزدیک بنیادی اہمیت اندر کی آواز کو حاصل ہے۔

سوال نمبر ۹: کن رسائل میں آپ کی تحریریں عموماً شائع ہوتی ہیں؟

جواب: مختلف وقتوں میں مختلف رسائل رہے ہیں۔ ابتداء میں "نگارِ پاکستان" اور "سیپ" میں چھپا، پھر "نئی قدریں" میں عرصہ تک میری تحریریں چھپتی رہیں میرے اپنے رسالہ "جدید ادب" میں بھی میری تحریریں چھپتی رہیں۔ ان دنوں میں "اوراق"، "تخلیق"، "تجدیدِ نو"، "منشور" پاکستانی رسائل میں اور بھارتی رسائل میں "دستک"، "شاعر"، "اسباق"، "گلبن" اور "توازن" کا نام شامل ہیں۔ صریر، ادبِ لطیف، بیسویں صدی، مفاہیم، نیا دور، راشٹریہ سہارا اور متعدد دیگر پاکستانی اور بھارتی رسائل میں بھی میری تحریریں چھپ چکی ہیں۔

سوال نمبر ۱۰: آپ کے کلام کا مجموعہ شائع ہوا؟

جواب: مطبوعہ کتب: سلگتے خواب (غزلیں)، عمرِ گریزاں (غزلیں، نظمیں، ماہیے)

روشنی کی بشارت (افسانے)، میری محبتیں (خاکے)

مرتب کردہ مطبوعہ کتب: شفق رنگ (ضلع رحیم یار کے اہم شعراء)

کرنیں (بہاولپور ڈویژن کے اہم شعراء)

سرائیکی غزل (ایک بحث کے ساتھ سرائیکی غزل کا انتخاب)

پہلا ورق (اوراق کے اداریوں کا مجموعہ)

ادارت: ''جدید ادب'' کی نو سال تک ادارت

سوال نمبر ۱۱: ادب اظہارِ ذات بھی ہے اور اظہارِ کائنات بھی۔ اس کے لیے آسان زبان اور اسلوب اپنایا جائے تو ابلاغ میں دشواری نہیں ہوتی کیا آپ اس سے متفق ہیں کیا ادب و

شاعری کے لیے ابلاغ ضروری ہے؟

جواب: بی بی! اگر ادب ذات اور کائنات کا اظہار ہے تو خود ہی سوچئے کیا یہ کائنات ایٹم کے پارٹیکلز سے لے کر عظیم کہکشاؤں تک کوئی آسان اور عام فہم کائنات ہے؟ اسی طرح دوسروں کی ذات کو چھوڑ دیں ہم میں سے ہر شخص اپنی ذات میں اتنا پیچیدہ ہے کہ زندگی بھر بھی اپنے آپ کو شائد ہی سمجھ پائے۔ اس لیے تو حضرت علیؑ نے فرمایا تھا کہ "جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا"۔ لہٰذا مشکل اور پیچیدہ ذات و کائنات کے اظہار کے لیے آسان زبان اور اسلوب کا مطالبہ کچھ مناسب نہیں لگتا۔ میں فن کے اظہار کے ساتھ اس کے ابلاغ کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہوں لیکن اگر کسی تخلیقی لمحے میں فنکار کسی ایسی ارفع سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا اظہار، ابلاغ کی عمومی سطح سے بلند ہو جاتا ہے تو میں اس کی عظمت کو بھی مانتا ہوں البتہ جدیدیت کے نام پر اور پی آر شپ کے زور سے جن لوگوں نے جان بوجھ کر ابلاغ کو مشکل بنایا ہے ان کے مصنوعی اظہار سے جو یبوست پھیلی ہے میں اس کی مذمت کرتا ہوں یہ سارے لوگ سرے سے ادیب ہی نہیں ہیں ذرائع ابلاغ پر قبضہ کے باعث اور پی آر شپ کے زور سے جو جعلی ادیب سامنے آئے ہیں ان کی جعل سازی خود بخود ختم ہو جائے گی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے نام نہاد "جدیدیوں" کا جدید ادبی رجحانات سے اور جدید ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سوال نمبر ۱۲: کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ تنقید ادب اور شاعری کے لیے نئی راہیں متعین کرتی ہے۔ اس سلسلے میں تنقیدی شعری محفلیں کس حد تک معاون ثابت ہوتی ہیں؟

جواب: ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "تنقید اور مجلسی تنقید" اس سوال اور اس سے متعلقہ دیگر متعدد سوالات کا شافی جواب ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اصل تنقید اور سطحی تنقید کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ اس سوال سے دلچسپی رکھنے والے سارے دوست مذکورہ کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔

سوال نمبر ۱۳: آج کے دور میں ادبی رسائل کی عدم مقبولیت سے شاعری کو نقصان پہنچ رہا

ہے۔ادبی کتابوں کی بھی پذیرائی نہیں ہوتی نہ ہی اس نوعیت کے ادبی ،علمی پروگرام ہوتے ہیں جو پہلے ہوتے تھے۔آپ اس مسئلے کی کیا حل پیش کرتے ہیں؟

جواب: ادبی رسائل اور کتب کا صرف اردو دنیا میں ہی نہیں ساری دنیا میں ایک جیسا حال ہے ۔شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ مادہ پرستی نے دنیا کو کسی اور راہ پر لگا دیا ہے۔ پھر بھی اردو رسائل کا دم غنیمت ہے۔ادب کی مقبولیت کے زمانہ میں جب ساقی ،ادبی دنیا اور ادب لطیف جیسے ادبی پرچے عوام میں مقبول تھے اگر ان سب کی سالانہ تعداد اشاعت جمع کر لیں اور پھر آج کے ہندو پاک کے ادبی جرائد کی سالانہ تعداد اشاعت جمع کریں لیں تو صورتحال بہت زیادہ مایوس کن نہیں ہوگی ۔ جہاں تک ادبی اور علمی پروگراموں کا تعلق ہے یہ انجمن سازی سے تعلق رکھتے ہیں اور میں اس معاملے میں بالکل اناڑی ہوں۔

سوال نمبر ۱۴: امریکہ میں آج کی پروان چڑھنے والی نسل زبان اردو سے تقریباً نابلد ہے۔اس طرح یہاں مستقبل میں اردو زبان ختم ہو جائے گی۔اردو کے شاعر ہونے کے ناطے آپ اس سلسلے میں کن اقدامات کا مشورہ دیں گے؟

جواب: آپ کی تشویش بجا ہے۔امریکہ میں ہی نہیں ،اِدھر یورپ میں بھی یہی صورت حال ہے۔لیکن ستم ظریفی دیکھیں کہ بعض پاکستانی اور بھارتی ادبی جرائد مغربی ممالک میں مقیم اردو ادیبوں کے ٹھکانوں کو "اردو کی نئی بستیاں" قرار دے رہے ہیں اور مغربی ممالک میں مقیم بعض ادیب اس پر بغلیں بھی بجا رہے ہیں۔حالانکہ انہیں اچھی طرح علم ہے کہ ان کی موجودہ نہیں تو اس سے اگلی نسل اردو سے بالکل بیگانہ ہو جائے گی ۔دوسرے مغربی ممالک میں اس مسئلے کو کیسے حل کیا جا سکتا ہے، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ جرمنی کے پاکستانیوں کو درپیش اس مسئلے کا حل موجود ہے۔اگر حکومت پاکستان ۔۔جرمن حکومت کے ساتھ ثقافت اور تعلیمی معاہدہ کر لے تو جرمن حکام اس کے لئے آمادہ ہیں کہ جرمنی کے جس سکول بھی آٹھ دس پاکستانی طلبہ ہوں وہاں اردو کی کلاسوں

کا انتظام ہو سکتا ہے۔لیکن حکومت پاکستان کو اس کے لئے کون احساس دلائے اور آمادہ کرے؟

سوال نمبر ۱۵ : کیا ہم اردو شاعری کے ذریعے ایسا ادب تخلیق کر رہے ہیں جو زندگی سے بھرپور ہو اور جس کی جڑیں ہماری زمین میں دور تک پیوست ہوں؟

جواب: اگرچہ اردو ادب میں ٹریش بھی بہت چھپ رہا ہے۔تاہم ایسا ادب بھی یقیناً تخلیق ہو رہا ہے جو زندگی سے بھرپور ہے اور جس کی جڑیں ہماری زمین میں دور تک پیوست ہیں۔

سوال نمبر ۱۶: "ادیب اور شاعر کی تحریریں اس کے وجود کا اقرار اور اس کے عہد کی گواہ بن جاتی ہیں"۔کیا آج کی شاعری اس قول کی ترجمان ہے۔؟

جواب: یہ قول ایک جزوی سچائی ہے۔آج کی شاعری بھی اور دوسری اصناف ادب بھی، ساری کی ساری تو نہیں لیکن بڑی حد تک اپنے تخلیق کار کے وجود کا اقرار بھی کرتی ہیں اور اسکے عہد کی گواہی بھی دیتی ہیں۔اس تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھیں:۔۔۔پرانی داستانوں میں اُڑن طشتریاں، اڑن قالین اور پریوں کو اڑانے والے داستان گو اپنے عہد سے آگے نکلے ہوئے تھے۔انہوں نے صدیوں پہلے ہوائی جہاز اور راکٹ کے زمانے کو اپنے ادبی کشف میں شامل کیا۔یوں وہ اپنے عہد سے زیادہ انسان کے مستقبل کے گواہ بن گئے ۔ادب کے حوالے سے کوئی نظریہ ہو یا فکری لہر۔۔۔سب اپنی اپنی جگہ جزوی سچائیاں ہیں۔

سوال نمبر ۱۷: تنقید نگار کہتے ہیں کہ آج کا ادب بے معنی ہوتا جا رہا ہے۔لفظ دل میں اترتا نہیں ،لفظ سچ نہیں بول رہا زندگی کسی اور سمت جا رہی ہے اور ادب کسی اور سمت جا رہا ہے۔ادب کا تعلق ہماری چاروں طرف کی زندگی سے باقی نہیں رہا۔ادب کا رشتہ زندگی کے دھارے سے ٹوٹتا جا رہا ہے۔کوئی نیا پن نظر نہیں آتا۔ چبائے ہوئے لقمے اگلے جا رہے ہیں۔۔۔۔آپ کی فکر کیا کہتی ہے؟

جواب: یہ باتیں تمام تنقید نگار نہیں کہتے ،بعض تنقید نگار کہتے ہیں۔۔۔جدیدیت کے نام پر جن

جعلی ادیبوں نے ادب میں لایعنی تحریروں کے انبار لگائے اور پھر پی آر شپ کے زور سے انھیں عظیم شاہکار قرار دلوایا۔ اگر محض انھیں مدنظر رکھ کہ بعض تنقید نگار پورے اردو ادب سے مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں تو یہ مناسب نہیں ہے۔ ایسے ناقدین محض نام نہاد جدیدیوں کو پڑھ کر ادب کے مطالعہ سے ہاتھ اٹھا بیٹھے ہیں وگرنہ سچے لفظ اور دل میں اترنے والے لفظ آج بھی صدائے کن کی طرح اتر رہے ہیں۔ ادب زندگی کا ماتحت نہیں ہے لیکن اس نے زندگی سے اپنا تعلق قائم رکھا ہوا ہے۔ ادب میں نیا پن بھی ہے۔ میرا ایک شعر ہے۔

جو میری روح میں بس زہر گھولتا ہی رہے
مرے نصیب میں چینی کا کارخانہ تھا

میں اس جیسی بیسیوں مثالیں اپنی شاعری میں سے اور سینکڑوں مثالیں آج کی شاعری میں سے دکھا سکتا ہوں۔ بتایئے اس شعر کا زندگی سے تعلق ہے یا نہیں؟ اس میں نیا پن بھی ہے یا نہیں؟
جہاں تک چبائے ہوئے لقموں کو اگلنے کا الزام ہے یہ تو غالبؔ پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعری میں اور بالخصوص غزل میں قافیہ ردیف کی پابندی اتفاقیہ گل کھلا دیتی ہے۔ اسے اتفا قیہ توارد کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔۔۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ اچھے شعراء کی تراکیب اور استعاروں کو کمتر درجے کے شعراء اس حد تک دہراتے ہیں کہ ان کا سارا حسن غارت ہو جاتا ہے۔ یہ عمل غالبؔ سے پہلے بھی
ہوتا رہا ہے، غالبؔ کے عہد میں بھی ہوا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے۔ البتہ آج یہ تماشہ بھی ہو رہا ہے کہ جو کمتر ادیب کسی اچھے ادیب کی خوشہ چینی کرتا ہے اسی کے خلاف حیلوں بہانوں سے کچھ نہ کچھ لکھتا بھی رہتا ہے۔ بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ادب ارتقاء پذیر ہے اور مایوسی والی کوئی بات نہیں ہے۔

سوال نمبر ۱۸: "ہر اچھا شاعر ذات کے حوالے سے روح عصر کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن

بڑی شاعری تب جنم لیتی ہے۔ جب اسکے پس منظر میں شاعر کا نقطۂ نظر، وسیع تجربات اور مثبت فکر و مطالعہ بھی شامل ہو"۔ آپ کے خیال میں آج اس پر عمل ہو رہا ہے؟ آپ چند شعراء کا حوالہ دینا پسند کریں گے؟

جواب: آپ کے سوال کے پہلے جملہ کے بارے میں ایک وضاحت کرنا بے حد ضروری ہے۔۔ اچھی شاعری کے لئے ضروری نہیں کہ وہ روحِ عصر کی عکاسی بھی کرے۔ اگر روح عصر کی عکاسی کرنا ہی اہم ہے تو پھر اخبارات یہ فریضہ ادب سے کہیں بہتر طور پر سرانجام دے رہے ہیں۔ ہوا میں انسان سمیت مختلف جاندار سانس لیتے ہیں۔ فی ذاتہ ہوا کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ وہ ہر جاندار کو اسکی مطلوبہ گیس فراہم کرے تاہم اگر ہوا سے ہم خود اکتساب فیض کر رہے ہیں تو یہ اضافی اور ہمارے فائدہ کی بات ہے۔ اسی طرح اگر اچھے ادب سے روح عصر کی عکاسی بھی ہو رہی ہے تو کوئی حرج نہیں لیکن یہ اچھے ادب کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ لازماً اس فرض کو ادا کرے۔ باقی اس میں کوئی شک نہیں اگر شاعر سچ مچ شاعر ہو تو اس کا نقطۂ نظر، وسیع تجربات اور مثبت فکر و مطالعہ مل کر اس کی شاعری میں انوکھی چمک پیدا کر دیں گے۔ آج کے زندہ شعراء میں اسکی سب سے تابندہ مثال وزیر آغا کی شاعری ہے۔

سوال نمبر ۱۹: (اگر آپ مزاح گو ہیں تو) کیا یہ سچ ہے کہ اپنی تحریر میں اپنا مذاق اڑانے وا لے ہی طنز کا بہتر ہنر جانتے ہیں؟

جواب: میں مزاح گو تو نہیں ہوں لیکن حسِ مزاح ضرور رکھتا ہوں۔ اچھے مزاح اور پھکڑ پن کے فرق کو بھی جانتا ہوں۔ آپ کی بات میں مجھے وزن محسوس ہو رہا ہے۔

سوال نمبر ۲۰: رشید احمد صدیقی نے کہا ہے کہ "طنز و ظرافت اس سفلی عمل کی طرح ہے جس میں اگر عمل پورا نہ ہو تو عامل خود ہی اس کا شکار ہو جاتا ہے"۔۔ آپ کسی حوالے سے اس قول کی تصدیق یا نفی کرنا چاہیں گے؟

جواب: رشید احمد صدیقی نے جس تناظر میں یہ بات کہی ہے درست کہی ہے۔اخبارات کے وہ فکاہی کالم نگار جو خود کو ادیب منوانے پر بھی مُصر ہیں چند ایک کو چھوڑ کر اکثر لطیفوں کی بھرمار سے، طنز کو دُشنام کی سطح تک لا کر۔۔۔۔۔اور مزاح کو بھانڈوں کے انداز میں پیش کر کے "طنز وظرافت" کے ادھورے سفلی عمل میں مبتلا ہیں۔ایسے بیشتر کالم نگار "نظریۂ ضرورت" کے تحت لکھ رہے ہیں اور اپنی اپنی حاجتیں پوری کر رہے ہیں۔کالم نگاروں کی ہی بات کیوں؟ادب میں تخلیق ہو یا تنقید جو لوگ بھی کسی نجی "نظریہء ضرورت" کے تحت لکھ رہے ہیں اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں ۔ادب کو دنیاوی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے آلہ کار بنانا اور پھر اسکے جواز میں "پرویزی حیلے" سے کام لینا اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے۔

(یہ تحریری انٹرویو ۲۰ ستمبر ۱۹۹۵ء کو مکمل کیا گیا)

حیدر قریشی سے انٹرویو

ثریا شہاب (جرمنی)

حیدر قریشی ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئے۔خان پور، رحیم یار خان ان کا آبائی علاقہ ہے پاکستان میں انہوں نے ایک مزدور کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تب ان کی عمر پندرہ سال تھی شوگرمل کی نوکری کے ساتھ انہوں نے پرائیویٹ طور پر سلسلہ تعلیم کو جاری رکھا۔ایم اے اردو تک تعلیم حاصل کی، وطن چھوڑنے سے پہلے ایبٹ آباد کی ایک معروف درسگاہ میں اردو کے استاد تھے، دسمبر ۱۹۹۳ء سے جرمنی میں مقیم ہیں۔۱۹۷۱ء میں ان کی شادی ہوئی تھی اور اسی برس انہوں نے اپنی پہلی غزل کہہ کر اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔حیدر قریشی کثیر الجہت ادیب ہیں۔ شاعری میں غزل، نظم اور ماہیے کہتے ہیں اس کے علاوہ افسانہ نگاری، خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری اور تنقید نگاری کے حوالے سے بھی انہوں نے ٹھوس ادبی کام کیا ہے۔ان کا تخلیقی کام معیار اور مقدار دونوں لحاظ سے اہم ہے۔گذشتہ دنوں ان سے ایک ملاقات میں جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل ''جہان ادب'' کے قارئین کی نذر کی جارہی ہے۔

سوال: وطن سے دور رہتے ہوئے آپ پر کیا اثر پڑا؟ آپ کی تحریر میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

جواب: دو اثرات تو ظاہری طور پر مرتب ہوئے ہیں نجی زندگی میں تنگدستی کا طویل سفر ختم ہو گیا

ہے،لیکن اداسی بڑھ گئی ہے۔کبھی کبھی تو اپنے شہروں کی گلیوں کے پتھر اور روڑے بھی شدت سے یاد آتے ہیں ممکن ہے رزق کی فراخی اور وطن کی یاد کے اثرات میری تحریروں میں آنے لگے ہوں۔ ویسے کسی قابل ذکر تبدیلی نے تحریروں میں اچانک نہیں آنا ہوتا یہ تو بس غیرمحسوس طریقہ سے آتی چلی جاتی ہے اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس کا علم ہو پاتا ہے۔

سوال: میں یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ انسان کا جس زمین سے رشتہ ہو جب وہ اس سے دور ہو جائے تو اس پر اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔خاص طور پر کسی تخلیق کار کی صلاحیتیں کیسے متاثر ہو سکتی ہیں؟

جواب: اپنے گھر، محلے، گلیوں، شہر اور وطن کی یاد آنا فطری امر ہے لیکن یہ بھی ہے کہ ہماری یادوں کا بیشتر تعلق اپنے گزرے زمانے اور اپنے ذاتی حوالوں سے ہوتا ہے۔ایک عرصہ کے بعد جب ہم ان پرانے مقامات کو دیکھنے جاتے ہیں۔تو وہاں کا سارا نقشہ تبدیل ہو چکا ہوتا ہے لیکن ہمارے من میں تو وہ سارے مناظر ویسے ہی آباد رہتے ہیں۔جب میں تقریباً دس برس کا تھا تب اباجی نے رحیم یارخان والا گھر فروخت کر دیا تھا جرمنی آنے سے دو سال پہلے میں اس محلے اور اپنے پرانے گھر کو دیکھنے گیا تو محلے کا سارا منظر تبدیل ہو چکا تھا۔مکان بالکل گرنے والا تھا۔اب تک گر چکا ہوگا۔۔۔ لیکن میرے دل میں بچپن کی وہ ساری رونقیں آباد ہیں۔ماضی کا منظر نامہ میرے پاس ہے اور میں اس کے "نہ ہونے" میں "ہونے" کا نظارا کر رہا ہوں۔اس کیفیت میں بیک وقت خوشی اور اداسی کی لہریں موجود ہیں۔یہ لہریں میری تخلیقات میں بھی ضرور ہوں گی۔

سوال: خاص طور پر جرمنی میں جہاں ادبی ماحول موجود نہیں ہے ادبی محافل نہیں ہوتیں۔ادبی مجلّے بھی دستیاب نہیں ہیں۔بحیثیت ادیب ذاتی طور پر آپ کے محسوسات کیا ہیں؟

جواب: جرمنی میں ادبی ماحول کی عمومی صورتحال تو یہی ہے جو آپ نے بیان کی ہے لیکن میرا ذاتی معاملہ قدرے مختلف ہے، بڑے اور صاحب علم ادیبوں سے شرف نیاز مندی اور دوستوں

سے گپ شپ کے باوجود روایتی ادبی محفلوں اور مشاعرہ بازی سے مجھے پاکستان میں بھی کوئی تعلق نہیں تھا اور یہاں بھی نہیں ہے۔پاکستان اور انڈیا کے اردو کے ادبی رسائل جن میں میری تحریریں بھی چھپتی ہیں میرے پاس باقاعدگی سے آتے ہیں۔سو یہ رسائل ہی میری ادبی محفل ہیں۔ایک خاص نوعیت کی تنہائی شروع سے ہی میرا مقدر رہی ہے۔جو جرمنی میں بھی میرے ساتھ ہے۔کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں قدیم برصغیر کی قوم کا کوئی دراوڑی کردار ہوں جو اپنی زندگی کی تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف حملہ آوروں کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ہر حملہ آور نے خود کو برہمن اور مجھے اچھوت قرار دیا ہے۔ہوسکتا ہے کبھی اندر سے تحریک ہو اور میں اپنی زندگی کی اس ٹریجڈی کو ناول کے روپ میں پیش کر دوں۔اگر یہ ناول لکھا گیا تو اس کا نام ہوگا "درجہ دوم کا شہری" ویسے زندگی بھر کی اس خاص نوعیت کی تنہائی کا ایک فائدہ تو ہوا ہے کہ مجھے اپنے اندر کی آواز سننے اور اپنے باطن سے ہم کلام ہونے کے مواقع ملے ہیں تخلیق کاری کے لئے ایسا ہونا بڑے نصیب کی بات ہوتی ہے۔

سوال: یورپ میں بالعموم اور جرمنی میں بالخصوص اردو ادب کے معیار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: میں ادب کی چھوٹی چھوٹی علاقائی تقسیم کو مناسب نہیں سمجھتا اگر کسی ملک میں دس ادیب ہوں اور میں خود کو ان دس میں سب سے بڑا سمجھ کر جرمنی کا یا کسی اور ملک کا عظیم شاعر یا افسانہ نگار بن بیٹھوں تو یہ ایک مضحکہ خیز صورت حال ہوگی میں کسی بھی ادیب کو پورے اردو ادب کے تناظر میں دیکھتا ہوں سو اچھے برے لکھنے والے ہر جگہ موجود ہیں جرمنی میں بھی اور باقی یورپ میں بھی بہت سے ادیب اردو ادب میں قابل قدر اضافے کر رہے ہیں اور اردو ادب ارتقا پذیر ہے۔

سوال: یوں تو آپ شاعری، افسانہ، خاکہ، انشائیہ اور تنقید تمام اصناف ادب میں مصروف کار ہیں لیکن ان میں سے کس صنف کو آپ اپنا خاص شعبہ سمجھتے ہیں؟

جواب: میں ادب کو مذہب اور سائنس کی طرح الگ ،آزاد اور بامعنی سرگرمی سمجھتا ہوں مختلف طریق کار ہونے کے باوجود مذہب اور سائنس کی جستجو کا رخ کائنات کے عظیم تر اسرار کی جانب ہے اور ادب بھی میرے نزدیک اسی کی جستجو سے عبارت ہے۔البتہ ادب کی جستجو کی نوعیت مجاز کے وسیلے سے جمالیاتی ہے۔سو کسی ایک صنف کو اپنا خاص شعبہ سمجھنے کی بجائے میں ادب کو اپنا شعبہ سمجھتا ہوں۔ہاں شاعری کو میں اپنی پہلی محبت مانتا ہوں۔

سوال: آپ نے اردو میں ماہیا نگاری کا رخ پنجابی ماہیے کے وزن کے مطابق کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اس سلسلے میں اب کیا صورت حال ہے؟

جواب: ۱۹۹۰ء میں میں اکیلا پنجابی ماہیے کے وزن کے مطابق اردو میں ماہیے لکھ رہا تھا اور آج چھ سال کے مختصر سے عرصہ میں درست وزن کو اپنانے والے ماہیا نگاروں کی تعداد (تادم انٹرویو) ۴۸ ہو چکی ہے۔میرے ماہیوں کا مجموعہ "محبت کے پھول" چھپ چکا ہے بھارت سے گیارہ اہم ماہیا نگاروں کا ایک اہم انتخاب بھی آگیا ہے صوبہ کرناٹک کا ایک روزنامہ اپنے ادبی صفحہ کا ماہیا نمبر چھاپ رہا ہے۔اگلے برس دو ماہیا نگاروں کے ماہیوں کے مجموعے آرہے ہیں ،میری تحقیق اور تنقید کی یک موضوعی کتاب "اردو میں ماہیا نگاری" بھی اگلے برس چھپ کر آرہی ہے۔پاکستان اور بھارت کے بعض ادبی رسائل نے ماہیا نمبر چھاپنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔بھارت کی ایک یونیورسٹی میں ماہیے کے موضوع پر پی ایچ ڈی لیول کا کام شروع ہونے کی خبر بھی ملی ہے سو یہ خوش کن صورتحال ہے۔

سوال: تخلیقی عمل اور مقصدیت کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تخلیق کار کے لئے لکھتے وقت کسی مقصد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے؟

جواب: جن لوگوں نے ادب کو حصول مقصد کا ذریعہ بنایا وہ بائیں بازو کے تھے یا دائیں بازو کے تھے۔انہوں نے ادب کی جگہ پمفلٹ پیش کیا۔ہر فنکار کا کوئی نہ کوئی نظریہ یا تصور ضرور ہوتا ہے سو

جب اس کا نظریہ اس کے باطن کی آواز بن کر آتا ہے تو اعلیٰ فن پارہ بن جاتا ہے۔لیکن جب وہ اپنے باطن کی آواز پر دھیان دیئے بغیر خارجی سطح پر اپنے نظریات کا پرچار شروع کرتا ہے تو صرف پروپیگنڈہ ادب کو وجود میں لاتا ہے۔اقبال اور فیض دو انتہاؤں کے نظریات رکھنے والے شاعر تھے لیکن دونوں نے زیادہ تر اپنے باطن کی آواز پر لکھا اس لئے وہ اعلیٰ شاعر تھے۔سو میرے نزدیک تخلیقی عمل کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے۔البتہ اس سے کسی مقصد کی ترجمانی بھی ہوتی ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اسے ایک مثال سے یوں سمجھ لیں کہ ہوا کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ ہر ذی روح کو اس کی مطلوبہ گیس فراہم کرے۔اگر ہوا سے یہ مقصد بھی حاصل ہو رہا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔یہی معاملہ ادب اور مقصدیت کا ہے۔

سوال: کیا نثری نظم کا تجربہ ارتقائی عمل کے بعد زندہ رہے گا؟

جواب: اگر نثری نظم والوں نے اسے شاعری قرار دلوانے پر سارا زور صرف کرنے کی بجائے خلیل جبران اور ٹیگور کی روایات سے آگے کا سفر کیا ہوتا تو اس نثر لطیف کا ارتقائی عمل ممکن تھا۔اب تو یہ تحریک صرف پبلک ریلیشننگ کے بل پر چل رہی ہے۔دراصل نثری نظم جو درحقیقت نثر لطیف ہے اس میں شعری مواد تو ہوتا ہے لیکن یہ شاعری نہیں ہوتی۔شعری مواد اور شاعری کے فرق کو یوں سمجھ لیں کہ تاج محل میں جتنا میٹریل استعمال ہوا ہے اس سب کا ڈھیر لگا دیا جائے تو وہ (شعری) مواد ہے اور جب اسی مواد کو شاعرانہ تخلیقی سطح پر برتا جائے تو وہ تاج محل ہے۔

سوال: موجودہ زمانہ سائنس اور حقیقت پسندی کا زمانہ ہے ان حالات میں شاعرانہ تصورات اور مبالغہ آرائی کا کیا مقام ہے؟

جواب: قدیم ادوار میں جو جادو کا تصور تھا وہ بھی حقیقتاً سائنس ہی تھی البتہ تب اُس زمانے کے سائنس دانوں نے اسے اپنا راز بنا کر رکھا اور جادو کا غلاف چڑھائے رکھا۔شاعری اور فکشن کا معاملہ بھی یوں ہے کہ پرانی داستانوں کی مبالغہ آرائی انسان کو سائنسی ترقی کے اس حیرت انگیز دور

تک لائی ہے مثلاً قدیم داستانوں میں دیووں، پریوں، اڑن کھٹولوں اور اڑن قالینوں کے تذکروں پرغور کریں تو یہ اڑنے کی انسانی خواہش تھی جسے اُس زمانے کے ادیبوں نے مبالغہ آرائی کی صورت میں بیان کیا اور پھر اس خواہش کو زندہ رکھا۔ میں ایسی داستانوں کو اُس زمانے کے فنکاروں کا تخلیقی کشف سمجھتا ہوں جو آج ہوائی جہاز اور راکٹ کی صورت میں ایک حقیقت بن چکا ہے۔ جام جم کو آپ سیٹلائٹ اور ٹی وی کے تناظر میں دیکھیں تو مبالغہ اور حقیقت میں فاصلے کا تعین کرنا مشکل ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر سائنسی انکشاف سائنسی زبان میں بھی پہلے فکشن ہوتا ہے۔ بعد میں وہی فکشن سچ قرار پاتا ہے ادب طبیعات سے زیادہ مابعد الطبیعات میں اور ظاہری حقیقت سے زیادہ اس کے عقب میں چھپی ہوئی سچائی میں دلچسپی لیتا ہے۔۔۔۔ اسی لئے نامعلوم کی دریافت کا سفر ادب میں زیادہ اہم ہے۔۔۔ اب تو ہماری جدید تر سائنس بھی Un Knowns اور Mystry میں دلچسپی لے رہی ہے اور سائنس دان خود اس عمل کے دوران حیرت زدہ ہیں۔

سوال: گروہ بندی کے ادبی فضا پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ آپ احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے گروہوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: ادبی گروہ بندیاں ہر دور میں رہی ہیں ہمارے قدیم شعراء ایک دوسرے کے خلاف ہجویات ہی نہیں لکھتے رہے، فرضی جنازے بھی نکالتے رہے ہیں۔ آج وہ دور ہے جب ہمارے معاشرے میں دکانداروں، موچیوں اور نائیوں تک کی انجمنیں بنی ہوئی ہیں۔ سوٹریڈ یونین کے اس دور میں ادیبوں نے بھی اپنے اپنے گروہ بنا لئے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ گروہ بندی اگر تخلیقی لحاظ سے مسابقت حاصل کرنے کے جذبے کو پروان چڑھائے تو ادب کے لئے بے حد مفید ہے لیکن اگر مادی مقاصد کے حصول کی دوڑ جیتنے کے لئے گروہ بندی ہے تو وہ اچھی چیز نہیں ہے۔ اردو ادب میں اگرچہ تخلیقی مسابقت حاصل کرنے والا جذبہ بھی موجود ہے تاہم مادی مقاصد کے حصول کی

افسوسناک مثالیں زیادہ ہیں۔ جہاں تک احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کا تعلق ہے میں دونوں بزرگوں کا احترام کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر دونوں بزرگ کسی تیسرے فرد کے بغیر مل بیٹھیں تو ان کی صلح ہو جائے گی کیونکہ دونوں کے اندر کہیں نہ کہیں ایک دوسرے کے لئے محبت چھپی ہوئی ہے۔ باقی تخلیقی لحاظ سے دونوں کے میدان الگ الگ ہیں۔ قاسمی صاحب انسانی قدروں کے ادیب ہیں جوان کی انسان سے محبت کا اظہار ہے جبکہ آغا جی کا فکری اور تخلیقی میلان مابعدالطبیعاتی اور کائناتی اسرار و رموز کی طرف ہے۔

سوال: کیا عصر حاضر کا نقاد اپنے تنقیدی رویوں میں غیر جانبدار اور دیانتدار ہے؟

جواب: نقادوں کے رویّے ملے جلے سے ہیں۔ بعض ناقدین مادی فوائد دیکھ کر جانبداری کر جاتے ہیں ڈنڈی بھی مار جاتے ہیں۔ گروہ بندی کے زیر اثر بھی چھوٹے موٹے گھپلے ہو جاتے ہیں اگر کسی ادیب کا دوست نقاد اُسے ۲۰ نمبر دے جبکہ وہ ۱۸ نمبروں کا مستحق ہے یا اس کا مخالف نقاد اسے ۱۸ نمبروں کی بجائے ۱۶ نمبر دیتا ہے تو قاری اتنی سی گڑ بڑ کو نظر انداز کر کے خود ہی حقیقت کا اندازہ کر لیتا ہے۔ لیکن جب ۱۰ نمبروں والے کو رعایت کر کے ۲۰ نمبر دے دیئے جائیں یا ۲۰ نمبر والے کو ۱۰ نمبر دیئے جائیں تو ایسے ناقدین اپنا بھرم آپ گنوا بیٹھتے ہیں۔ میں نمبروں کی یہ مثال دینے پر معذرت چاہتا ہوں لیکن وضاحت کے لئے ایسا ضروری تھا۔ ہمارے ہاں دونوں طرح کے نقاد ہیں مفاد پرست نقاد بھی ہیں اور ایمانداری سے لکھنے والے بھی ہیں لیکن کسی اچھے اور سچے تخلیق کار کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ نقاد کیا کہہ رہا ہے اس کا مسئلہ تو یہ ہے کہ اسے اپنے اندر سے کیا سنائی دے رہا ہے۔

(یہ انٹرویو ڈیلی جنگ لندن کے شمارہ ۷ر نومبر ۱۹۹۶ء کے ادبی صفحہ ''جہانِ ادب'' میں شائع ہوا)

10 سوالوں کے جواب

سوالات از سلطانہ مہر (امریکہ)

جواب از حیدر قریشی (جرمنی)

(سلطانہ مہر نے اپنی کتاب ''گفتنی'' کے لئے یہ تحریری انٹرویو لیا تھا۔ ''گفتنی'' میں کتاب کی ضرورت کے مطابق اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہاں اس کا مکمل متن دیا جا رہا ہے۔)

سوال نمبر ا: اپنا پورا نام، قلمی نام، تاریخ و جائے پیدائش، تعلیم و ملازمت اور مختصر سوانح لکھیے۔

جواب: **پورا نام**: قریشی غلام حیدر ارشد۔۔۔**قلمی نام**: حیدر قریشی

تاریخ پیدائش: سرکاری کاغذات میں یکم ستمبر 1953ء۔

مستند خاندانی روایت کے مطابق 13 جنوری 1952ء

جائے پیدائش: ربوہ ضلع جھنگ

تعلیم و ملازمت: 1968ء میں دسویں کا امتحان پاس کرتے ہی جئی سنز شوگر ملز

خانپور میں مزدوری شروع کر دی۔ یہ 78 روپے ماہانہ کی سیزنل ملازمت تھی۔ اسی دوران پرائیویٹ طور پر 1970ء میں ایف۔اے، 1972ء میں بی۔اے اور 1974ء میں ایم۔اے (اردو) کے امتحانات میں شرکت کی اور کامیابی حاصل کی۔ مناسب ملازمت کے لیے کوشاں رہا لیکن نہیں ملی۔ 19 سال تک شوگر مل کی نوکری کرنے کے بعد اس ملازمت کو چھوڑ دیا۔ تین سال بے روزگاری کے دن کاٹے اور "تماشائے اہل کرم" دیکھا۔ 1990ء میں مجھے ایبٹ آباد میں درس و تدریس کی ایسی جاب مل گئی جس کے لیے میں ہمیشہ خواب دیکھا کرتا تھا۔ 1992ء میں بوجوہ ارضِ وطن کو خیر باد کہنا پڑا اور اب میں جرمنی میں مقیم ہوں۔ 1971ء میں میری شادی ہو گئی تھی۔ ہمارے 5 بچے ہیں۔ تین بیٹے، دو بیٹیاں، بیوی بچے سب یہاں جرمنی میں ہیں، فالحمدللہ۔

سوال نمبر ۲: بیسویں صدی ختم ہونے کو ہے۔ کیا بیسویں صدی میں اردو ادب کی تاریخ میں موجود رہ جانے والے چند ادیبوں کے نام آپ گنوا سکتے ہیں؟

جواب: غالبؔ پچھلی صدی کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر بھی غالبؔ ہے۔ غالبؔ کے بعد اقبالؔ اور فیضؔ تو لازماً اردو ادب کی تاریخ میں موجود رہیں گے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب اور وزیر آغا دونوں اہم ترین ادیب ہیں۔ کچھ گروہ بندیوں کے باعث اور کچھ بعض لوگوں کے ذاتی تعصّبات کے باعث۔ دونوں حلقوں کی طرف سے قاسمی صاحب اور آغا صاحب کے ادبی انہدام کی کوششیں کی گئی ہیں اس کے باوجود احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا دونوں مقتدر ادیب بیسویں صدی میں اردو ادب کی تاریخ کا روشن حصہ رہیں گے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، جوگندر پال، انتظار حسین، ممتاز مفتی کے نام بھی جگمگاتے رہیں گے۔ اس صدی کے آخری دو عشروں میں ابھرنے والے کئی ادباء بھی یاد رکھے جائیں گے تاہم ان کے ناموں کے چناؤ کا صحیح فیصلہ آنے والی دو تین دہائیوں میں ہو پائے گا۔ اس کے باوجود مجھے کبھی کبھی تشویش ہونے لگتی ہے کہ اکیسویں صدی میں خود ادب کا کیا مستقبل ہوگا۔

سوال نمبر ۳: فکشن ایک لطیف آرٹ ہے۔ جدیدیت نے اس آرٹ کی لطافت اور اس کے حسن کا نکھارا، یا سنوارا ہے یا اسے مجروح کیا ہے؟

جواب: جدیدیت کے زیرِ اثر افسانہ نگاری کی دو بڑی لہریں چلی تھیں۔ ایک لہر نامور نقادوں کی سرپرستی میں لایعنی تجریدی افسانہ نگاری کی تھی اور دوسری لہر جدیدیت کے مثبت اثرات والی افسانہ نگاری کی تھی جس میں افسانہ نگاروں نے افسانے کو اکہرے بیانیہ کے مقابلے میں زیادہ بامعنی بنا دیا تھا۔ لایعنی تجریدیت والا جدید افسانہ اپنی موت آپ مر گیا ہے جبکہ مثبت اثرات والا افسانہ اب اردو افسانے کی شناخت ہے۔

سوال نمبر ۴: موجودہ صدی میں اردو ادب میں بہت کم ناول لکھے گئے ہیں۔ آپ کے نزدیک اس کی کیا وجوہ ہیں؟

جواب: اردو میں کمرشل رائیٹرز نے تو بے شمار ناول لکھے ہیں لیکن ادبی ناول بے شک کم ہی لکھے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ہاں داستان کی اپنی مضبوط روایت موجود تھی۔ داستان بظاہر ایک طویل قصہ ہوتا تھا لیکن حقیقتاً کئی قصوں کا مجموعہ ہوتا تھا۔ یعنی اس میں بیان کیے گئے قصے اپنی اپنی الگ اور مکمل کہانی بھی سناتے تھے اور اپنی مجموعی صورت میں ایک بڑی کہانی کو بھی مکمل کرتے تھے۔ غور کریں تو غزل کی صورتحال بھی کچھ ایسی ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل مضمون بیان کرتا ہے لیکن پوری غزل پھر ایک مجموعی تاثر کو اُبھارتی ہے۔ داستان اور غزل کا یہ مزاج دراصل مشرقی مزاج ہے۔ جُز میں کُل کو دیکھنے والا انداز۔ شاید اسی مشرقی مزاج کے باعث ہمارے ہاں افسانہ نگاری زیادہ مقبول ہوئی اور ناول نگاری کی طرف بہت کم رجحان ہوا۔ ناول کا انداز بنیادی طور پر مغربی مزاج سے میل کھاتا ہے۔ مغربی ماحول صوفیانہ رمزوں کو بہت کم سمجھ پایا ہے شاید اسی لیے اس نے جُز میں کُل کا نظارہ نہیں کیا۔ ناول کسی حد تک اسی مغربی مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔ تاہم اردو میں جتنے اچھے ناول لکھے گئے ان پر مشرقی مزاج کا عکس بھی موجود ہے۔

سوال نمبر ۵: آج کا ادیب نہ صرف مادی بلکہ ذہنی نفسیاتی اور روحانی بحران میں مبتلا ہے۔ بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے وہ کسی نظامِ فکر کی تلاش میں ہے۔ اس کی راہنمائی کس طرح ہو؟

جواب: آپ نے جن بحرانوں کی نشاندہی کی ہے ان میں تو ساری دنیا مبتلا ہے۔ یہ مسئلہ صرف ادیبوں کا نہیں، کرہ ارض کے سارے انسانوں کا ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ ہم قناعت کو بھول کر حرص و ہوس کی دوڑ میں شامل ہو گئے ہیں۔ جہاں تک کسی نظامِ فکر کی تلاش کا سوال ہے۔ آپ کسی مذہب، کسی مسلک اور کسی نظریے کے مبلغین سے بات کریں تو وہ یہی بتائیں گے کہ ہمارے مذہب، ہمارے مسلک یا ہمارے نظریے کو دنیا پر لاگو کر دیں تو سارے بحران ختم ہو جائیں گے۔ حالانکہ اپنے نظریات پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے باوجود وہ لوگ بھی اسی طرح ذہنی، نفسیاتی اور روحانی بحران میں گھرے ہوئے ہیں جیسے باقی دنیا ہے۔ میرے خیال میں اگر انسان زندگی کے ہر شعبہ میں حرص و ہوس کو چھوڑ دے (ترقی کرنے کی خواہش اور حرص و ہوس میں واضح فرق ہے) اور اربابِ اختیار عدل کو اپنا شعار بنا لیں تو سارے بحران آہستہ آہستہ ختم ہو سکتے ہیں۔ لیکن نہ تو دنیا بھر کے اربابِ اختیار عدل و انصاف سے کام لیں گے اور نہ ہی ناانصافیوں سے تنگ آئے ہوئے لوگ آگے بڑھنے کے لیے ناجائز ہتھکنڈے چھوڑیں گے۔ سو ہمارے ذہنی، قلبی اور روحانی عوارض کا کوئی علاج نہیں ہے۔ جو بظاہر معالج بنے ہوئے ہیں وہ خود اندر سے اتنے ہی بیمار ہیں جتنا کوئی عام آدمی۔

سوال نمبر ۶: شاعری ہو یا نثر۔۔۔معیاری ادب کے پیمانے کیا ہیں؟

جواب: ہمارے بعض سرکردہ ناقدین کرام نے ادب میں جس طرح کرپشن پھیلائی ہے اس کے بعد لگتا ہے جیسے معیاری ادب کا کوئی پیمانہ سلامت ہی نہیں رہا۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ جو تخلیق پڑھتے ہوئے دل کو چھو لے یا پھر ذہن کو بیدار کر کے سوچ کو متحرک کرے اسے عمدہ ادب میں شمار کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قاری کند ذہن نہ ہو۔ ذہین بھی ہو اور صاحبِ دل

بھی۔

سوال نمبر ۷: پاکستان اور ہندوستان سے باہر اردو میں شاعری زیادہ ہو رہی ہے۔نثر بہت کم لکھی جا رہی ہے اس کا سبب وقت اور موضوعات کی کمی ہے یا جرأت کی؟

جواب: برِصغیر سے باہر رہنے والے اردو کے ادبائے کرام کے پاس نہ موضوعات کی کمی ہے نہ جرأت کی۔ وقت کی کمی بھی زیادہ بڑا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ جب اندر سے لکھنے کی تحریک ہوتی ہے تو لکھنے والا وقت خود ہی نکال لیتا ہے۔شاعری ہو یا نثر۔۔۔۔لکھنے والے کے ذاتی رجحان اور اندر سے ملنے والی توفیق پر ہی لکھنا ممکن ہے۔سو ہر کوئی اپنے رجحان اور توفیق کے مطابق لکھ رہا ہے۔نثر اگر کم لکھی جا رہی ہے تو اس کا سبب بھی لکھنے والوں کا رجحان نہ ہونا اور اندر کی توفیق کی کمی ہے۔

سوال نمبر ۸: اردو کئی زبانوں کا مجموعہ ہے لیکن دیکھا جا رہا ہے کہ انگریزی زبان کے الفاظ کی شمولیت سے گریز ہو رہا ہے جبکہ انگریزی دنیا کی بڑی علمی زبان ہے۔فارسی اور عربی تو نئے علوم سے مجروح زبانیں ہیں۔آپ کا کیا خیال ہے؟اس طرح اردو کی ترقی رُک نہیں جائے گی؟

جواب: آپ کے اس سوال کے جواب میں الگ الگ طور پر چند وضاحتیں کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔اردو بے شک کئی زبانوں کا مجموعہ ہے لیکن اس میں الفاظ کی شمولیت فطری انداز میں ہوتی رہی ہے۔مختلف زبانوں کے جو الفاظ اسے راس آ جاتے ہیں یہ انہیں جذب کر کے اپنا حصہ بنا لیتی ہے اور جو الفاظ اسے راس نہیں آتے وہ شعوری طور پر رائج کرنے کی کاوش کے باوجود متروک ہو جاتے ہیں۔ انگریزی الفاظ کو شعوری طور پر اردو کا حصہ بنانا ویسے کوئی مستحسن عمل نہیں ہوگا۔ انگریزی بے شک دنیا کی بڑی علمی زبان ہے۔ جو حیثیت اردو کی برصغیر میں ہے وہی حیثیت انگریزی کی پوری دنیا میں ہوگئی ہے۔ یہ رابطے کی زبان بن چکی ہے۔۔۔۔۔تاہم انگلینڈ کو چھوڑ کر باقی سارے یورپ میں انگریزی کی حیثیت ثانوی ہے۔چین میں یہ حیثیت ثانوی بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود پورے یورپ اور چین کی ترقی سب کے سامنے ہے۔ فارسی اور عربی بے حد امیر

اور زرخیز زبانیں ہیں۔ نئے علوم کی اصطلاحوں کے متبادل الفاظ اگر ان زبانوں میں زیادہ نہیں ہیں تو یہ سائنسی میدان میں پیچھے رہ جانے کی نشانی ہے لیکن اس سے ان دونوں زبانوں کی زرخیزی کی نفی نہیں ہو جاتی۔زبانوں کی نشوونما میں ان کی داخلی قوت نمو اور خارجی حالات کا برابر کا اثر ہوتا ہے۔تاریخی تسلسل میں جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہنا ہے۔

سوال نمبر ۹: اپنی زندگی کے چند اہم اور دلچسپ واقعات ضرور لکھیے۔

جواب: اہم واقعات کے لیے ضروری نہیں کہ دلچسپ بھی ہوں۔بہر حال میری زندگی کے اہم واقعات میں سب سے اہم واقعہ (سانحہ) میرے والد صاحب کی وفات کا تھا۔ ہمارے خاندان میں طویل مدت کے بعد یہ پہلی فوتگی تھی۔اس سے مجھے ہجر کے ایک نئے رُخ سے شناسائی ہوئی۔ ابا جی سے میری ہر سطح پر گہری وابستگی تھی ان کی جدائی نے مجھے باہر سے زیادہ اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ان کے بعد دو سال کے اندر اندر والدہ صاحبہ بھی فوت ہو گئیں۔امی جی کی وفات میری زندگی کا دوسرا اہم واقعہ تھا۔ابا جی کی وفات نے جس ہجر سے آشنا کیا تھا امی جی کی وفات اسی ہجر توسیع تھی۔لیکن اس ہجر کے دکھ نے مجھے تخلیقی سطح پر متحرک کیا۔میری تخلیقات میں رشتوں کی جو خاص اہمیت ظاہر ہوئی ہے وہ انہیں فوتگیوں کا نتیجہ ہے۔

دلچسپ واقعات میں سے مجھے ایک تو اپنے بچپن کا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ہمارے بابا جی (تایا جی) نے جب پہلی بار گراموفون مشین پر ریکارڈ لگایا تو آپی نے اور میں نے۔ہم دونوں نے یہی سمجھا کہ مشین کے اندر گانے والے لوگ چھپے بیٹھے ہیں۔چنانچہ کبھی ہم لکڑی کے بکس کو کھٹکھٹاتے کبھی بھونپو کے اندر جھانک کر انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے۔اپنے بچپن کی یہ معصومیت مجھے اس وقت پھر یاد آئی جب پچھلے دنوں میری بڑی بیٹی ہمارے ہاں آئی ہوئی تھی۔ٹی وی آن تھا۔سامنے میرا نواسہ رُومی کھیل رہا تھا۔اچانک ٹی وی پر ایک نیم برہنہ سا اشتہار آیا۔دو سالہ رومی کی اس پر نظر پڑی تو کھیلنا چھوڑ کر اشتہار کی طرف متوجہ ہو گیا۔میں نے ٹیکسٹ کا بٹن دبایا

تو رومی نے مڑ کر مجھے دیکھا اور سمجھ گیا کہ میں نے کوئی گڑ بڑ کی ہے۔ میں بالکل انجان ہو گیا تو رومی دوڑ کر ٹی وی کے قریب گیا اور جھک کر یوں ٹیکسٹ کی عبارت کے نیچے سے دیکھنے لگا جیسے شاید نیچے سے اس نیم برہنہ اشتہار کی کوئی جھلک دکھائی دے جائے۔ اس کی اس معصومیت پر مجھے اپنا گرامو فون مشین والا واقعہ یاد آ گیا۔

مبارکہ کی ایک سہیلی یہیں جرمنی میں مقیم ہے۔ ایک بار مبارکہ سے کہنے لگی یہاں اتنے اچھے اور سستے ریڈیو ملتے ہیں میرا جی کرتا تھا ایک دو سیٹ لے کر پاکستان بھجوا دوں لیکن پھر یہ سوچ کر رُک گئی کہ یہاں کے ریڈیو سیٹ پر جرمن زبان کے پروگرام آتے ہیں۔ پاکستان والے تو انہیں سمجھ ہی نہیں سکیں گے۔ بظاہر یہ لطیفہ سا لگتا ہے لیکن میں اسے انسانی معصومیت اور بھولپن سمجھتا ہوں۔ واقعات تو بہت سارے ہیں لیکن انہیں بیان کرتے وقت تفصیل میں جانا پڑے گا۔ لہٰذا ان مختصر واقعات پر اکتفا کرتا ہوں۔

سوال نمبر ۱۰: اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ نہ عملی نہ نظریاتی ترقی ہو رہی ہے۔ نظریات کا مطلب کسی ازم کی نشاندہی نہیں اس اصطلاح کو وسیع تناظر میں رکھتے ہوئے اس کے اسباب بتائیں۔ نیز تراجم بھی زیادہ نہیں ہو رہے۔ پاکستان میں تو علاقائی زبانوں پر بھی کوئی خاص کام نہیں ہو رہا۔ کیا اس سے اردو زبان کو نقصان نہیں پہنچ رہا؟

جواب: اصل معاملہ یہ ہے کہ بعض مصلحت پسند اور مفاد پرست قسم کے نقادوں نے اتنی غلط بخشیاں کی ہیں کہ عام قاری یہی محسوس کرنے لگتا ہے کہ اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے جبکہ عملی اور نظری تنقید میں خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ اس پیش رفت میں بعض منفی رویے بھی در آئے ہیں۔ اسے سوچ کا فرق بھی کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ساختیات کو مغرب سے ترجمہ کر کے اپنا لینے والوں نے مصنف کی موت کا اعلان کیا، ادب پارے کے متن کو غیر اہم قرار دیا اور ساری اہمیت قاری کو عطا کر دی۔ پڑھنے والا فن پارے کا مطالعہ کرتے ہوئے جو چاہے معنی اخذ کرے، اسی کو

اہمیت حاصل رہے گی۔ یہ حقیقتاً قاری کا آڑ لے کر نقادوں کی تخلیق کاروں پر بالادستی حاصل کرنے کا ڈرامہ ہے۔ اس کرپشن کے برعکس ہمارے ایسے ناقدین جو خود اچھے تخلیق کار بھی ہیں انہوں نے قاری کی اہمیت کو ماننے کے باوجود مصنف اور متن کی نفی کرنے کو غلط قرار دیا اور واضح کیا کہ اگر مصنف نہیں ہوگا تو فن پارہ کہاں سے آئے گا؟ فن پارہ نہیں ہوگا تو قاری (دراصل نقاد) پڑھے گا کیا؟ یہ سامنے کی ایک مثال ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہیں کہ اردو ادب میں تنقید برائے نام نہیں ہے۔

جہاں تک تراجم کی بات ہے میرا خیال ہے اردو میں دوسری زبانوں کا ادب ترجمہ ہو کر سامنے آتا رہتا ہے اور اب تو اردو والوں کی تخلیقات بھی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونے لگی ہیں لہٰذا یہ شکوہ بجا نہیں ہے۔ پاکستان میں علاقائی زبانوں پر کافی کام ہوا ہے اور یہ کام علاقائی زبانوں کے ادب سے متعلق افراد نے ہی کیا ہے۔ علاقائی زبانوں نے اردو زبان پر گہرا اثر مرتب کیا ہے۔ انڈیا میں وہاں کی علاقائی زبانوں کا واضح اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ بعض منفی اثرات کے باوجود مجموعی طور پر اردو زبان کو اس سے فائدہ ہی ہوا ہے۔ اردو کو نقصان اگر پہنچا ہے تو انڈیا اور پاکستان کی حکومتوں سے پہنچا ہے۔ انڈیا میں ہندی اسکرپٹ کے چکر میں اردو رسم الخط کو ایک بڑی سطح سے ہٹا دیا گیا ہے۔ پورے برصغیر کے رابطہ کی زبان کو علاقائی زبانوں میں شمار کیا جانے لگا ہے جبکہ پاکستان میں اردو کو سرکاری زبان ماننے کے باوجود عملاً
انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ ''اشرافیہ'' طبقہ کے لوگ انگریزی میڈیم تعلیمی اداروں سے پڑھ کر آتے ہیں اور بیوروکریسی، فوج اور حکومت تک مسلط ہیں۔ اردو میڈیم تعلیمی اداروں کی شناخت "ٹاٹ سکول" والی ہے۔ یہی پاکستانی عوام کی بڑی اکثریت کا مقدر ہے۔

☆☆☆

(یہ تحریری انٹرویو ۲۹ر دسمبر ۱۹۹۸ء کو مکمل کیا گیا)

حیدر قریشی سے ایک مکالمہ

محمد وسیم انجم (راولپنڈی)

حیدر قریشی کی پہلو دار شخصیت میں شاعر اور نثر نگار مختلف جہتوں میں نمایاں ہیں۔ یہ اردو ادب کی بیشتر اصناف میں بھرپور حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کا دائرہ 25 برسوں پر محیط ہے۔ جو خانپور کے جیٹھہ بھٹہ بازار میں ایک فرشی نشت اور ہفت روزہ "مدینہ" بہاولپور میں صحافتی و ادبی ڈائری سے شروع ہوتا ہے۔ پھر شاعری اور نثر میں بھرپور تخلیقی و تحقیقی کاوشیں رونما ہوئیں۔ جن کی بدولت ایک تخلیق کار جلوہ افروز ہیں۔

وسیم انجم: حیدر قریشی صاحب! سب سے پہلے ہمیں اپنے خاندان کے پس منظر سے آگاہ کرتے ہوئے یہ بتائیے کہ آپ سے قبل ایسی صلاحیتوں کی مالک کوئی شخصیت ادب کے آسمان پر اس طرح جگمگائی جس حیثیت سے آپ آسمان ادب کے افق پر روشن ستارہ ہیں۔ اور کیا نسل نو میں بھی ایسے جراثیم پائے جاتے ہیں؟

حیدر قریشی: میرے والد صاحب کی کپڑے کی دوکان تھی۔ ہمارا خاندان متوسط طبقے کا

خوشحال گھرانہ تھا۔ لیکن جب ابا جی کا کاروبار زوال کا شکار ہوا تو نہ صرف ابا جی کلاتھ مرچنٹ سے ٹیلرنگ شاپ تک آ گئے بلکہ ہم لوگ بے حد تکلیف دہ غربت کی زد میں آ گئے۔ میرے خاندان میں صرف میری امی جی کو ادب کے مطالعہ کا شوق تھا۔ ایک زمانے میں انہوں نے پنجابی میں ایک دعائیہ نظم بھی کہی تھی۔ ہاں میرے میرے سب سے چھوٹے ماموں حبیب اللہ صادق کسی زمانے میں شاعری کرتے تھے۔ اور میں بچپن میں انہیں حیرت اور خوشی سے دیکھا کرتا تھا۔ کہ میرے ایک ماموں شاعر بھی ہیں۔ باقاعدہ طور پر میں ہی ادبی دنیا میں آیا ہوں۔ نسل نو میں ابھی تک کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جس سے امیدیں وابستہ کی جا سکیں۔ اپنی چھوٹی بیٹی سے مجھے کچھ توقع تھی۔ لیکن ابھی تک کوئی بہتر اور یقینی صورت نظر نہیں آ رہی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ میرے دونوں چھوٹے بچے ٹیپو اور مانو عام طور پر میری نئی تحریریں میرے پاس آ کر مجھ سے سنتے ہیں۔ اور پھر انہیں پڑھتے بھی ہیں۔ جرمنی میں شاید یہ بھی غنیمت ہے۔

وسیم انجم: شاعر اور ادیب بیک وقت خاندان کا رکن، معاشرے کا فرد اور معاشی عمل کا پرزہ ہوتا ہے۔ ان سب سے آپ کس حد تک انصاف کر پاتے ہیں؟

حیدر قریشی: اپنے والدین کی میں نے بساط کے مطابق خدمت کرنے کی کوشش کی تھی۔ بیوی بچوں کے ساتھ میرا رشتہ محبت اور دوستی کا ہے۔ پاکستان میں تو میں اپنے بیوی بچوں کو کچھ نہیں دے پایا تھا۔ لیکن انہوں نے ہر دکھ میں ساتھ نبھایا۔ میرے پاکستانی معاشرے نے معاشی تنگدستی کے باعث مجھے خودکشی کے مقام تک لا کھڑا کیا تھا۔ اس گناہ سے بچ گیا ہوں تو سراسر خدا کا فضل اور احسان ہے۔ پاکستان میں تھا تو اپنے معاشرے اور معاشی نظام سے دکھی تھا۔ لیکن اب جرمنی میں آ گیا ہوں تو وہی معاشرہ شدت سے یاد آتا ہے۔ اور اداس کرتا ہے۔ میں نے ساری زندگی محنت مزدوری کر کے گزار دی ہے۔ ایک محنت کش، مزدور اپنے معاشرے اور معاشی نظام سے جتنا انصاف کر سکتا ہے اتنا تو میں نے کیا ہی ہے۔

وسیم انجم: آپ کی تصانیف " عمر گریزاں " اور " میری محبتیں " میں تاریخ ولادت متنازعہ تھی ۔جس کی وضاحت دوماہی " گلبن " احمد آباد بھارت کے ماہیا نمبر میں کردی گئی ۔اس کے پس منظر میں علامہ اقبال کی متنازعہ فیہ تاریخ ولادت تونہیں جوایک تحقیق طلب مسئلہ ہے؟

حیدر قریشی : ہوسکتا ہے غیرارادی طور پر یہی وجہ رہی ہو۔لیکن بھائی ! کہاں علامہ اقبال اور کہاں میں ایک معمولی سا ادیب۔

وسیم انجم: آپ نے محمد امین زبیری کی کتاب ''خدوخال اقبال'' پر تبصرہ تحریر کیا تھا۔جو مجلّہ ''اوراق'' کے اکتوبر نومبر ۱۹۸۵ء شمارہ میں شائع ہوا۔اس کے بعد آپ نے اقبالیات پر کچھ تحریر نہیں کیا۔البتہ آپ کی شاعری میں فکر اقبال کے ساتھ ساتھ غالب اور ڈاکٹر وزیر آغا کے اثرات بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔آپ کونسی شخصیت سے زیادہ متاثر ہیں۔اور کیوں؟

حیدر قریشی :" خدوخال اقبال " پر میرا جو تبصرہ چھپا تھا اس کے پس منظر میں میرا اُس وقت کا فکری منظر نامہ موجود تھا۔اس کے بعد علامہ پر کچھ نہیں لکھا تو اس لئے کہ ان پر نیا لکھنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔آپ نے اب میری شاعری پر غالب اور وزیر آغا کے ساتھ اقبال کے اثرات کی بات کی ہے تو مجھے حیرت ہوئی ۔۔۔۔اب میں نے غور کیا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ اقبال تو لاشعوری طور پر میرے اندر گھسے ہوئے ہیں ۔

وسیم انجم: اردو ماہیا میں آپ نے بھرپور تخلیقی وتنقیدی کام کیا ہے۔اس تحریک کو آگے بڑھانے میں آپ کی کاوشوں کا اعتراف ضروری ہے۔جس کے مطابق ماہیے کی ہیئت اور وزن کا معاملہ تو تقریباً طے پا گیا ہے۔ لیکن اس کے مزاج کے متعلق پیش رفت کی مزید ضرورت ہے۔ اہل قلم کے تنقیدی مضامین اور موجودہ ادبی حالات کے تناظر میں مختلف آراء کے ساتھ ماہیے کے مستقبل کا تعین کریں۔

حیدر قریشی : اردو ماہیے کو میری وجہ سے فائدہ بھی ہوا ہے اور نقصان بھی پہنچا ہے۔فائدہ تو

یہی کہ ماہیا ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا ہے۔نقصان یہ ہوا کہ مجھ سے کسی کو کوئی ناراضگی تھی ، کوئی برہمی تھی تو اس کا بدلہ لینے کے لئے ماہیے کو زد پر رکھ لیا گیا۔حاسدین اور علمی سطح پر بے بس ہو جانے والوں نے بھی ادبی فضا کو گرد آلود کرنے کی کوشش کی ۔یوں میری ہی وجہ سے ماہیے کو نقصان پہنچا ہے۔تاہم اب امین خیال ، ناصر عباس نیّر ، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ، احمد حسین مجاہد ، گوہر شیخ پوری ، شارق جمال ، اسلم حنیف ، رؤف خیر ، اختر رضا کیکوٹی اور عارف فرہاد اور آپ جیسے نوجوانوں کے آگے آنے سے اردو ماہیے کی تنقیدی فضا بہتر ہو رہی ہے۔مزید بھی کئی اہم ادیب اس طرف توجہ کرنے لگے ہیں۔مزاج کا معاملہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ طے ہوتا جائے گا۔

وسیم انجم: اردو ماہیے کے حوالے سے بعض معترضین نے آپ پر الزامات بھی عائد کئے ہیں جو ادب سے زیادہ مذہب پر مبنی ہیں۔آپ اپنی صفائی میں کچھ بیان کرنا پسند فرمائیں گے۔

حیدر قریشی : آپ خود بتایئے ماہیے کی علمی بحث میں کسی بھی مذہب یا مسلک کے تنازعہ کا کھڑا کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ مذہب ہر انسان اور خدا کا براہ راست معاملہ ہے۔ ہر شخص اپنے عقیدے اور اعمال کے مطابق اگلے جہان میں جزا اور سزا پائے گا۔ میں اس وقت اپنے عقیدے کی وضاحت کر کے بہت سے مخالفوں کو شرمندہ کرسکتا ہوں۔لیکن میں کسی مذہبی بلیک میلنگ کا شکار ہو کر کبھی بھی کسی کے دباؤ میں نہیں آؤں گا۔ ماہیے کی بحث کو کافروں کی انتشار پیدا کرنے کی سازش کہہ کر ہمارے مخالفین نے حقیقتاً علمی سطح پر اپنی بے بسی اور شکست کا اعتراف کرلیا ہے۔اب ان کے پاس بہتان طرازی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔اسی لئے اختر رضا کیکوٹی نے بروقت ایسے عناصر کا تعاقب کیا تھا اور احمد حسین مجاہد نے بھی بجا طور پر ان کے بارے میں لکھا تھا " اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے پاس اردو ماہیے کے وزن کے مسئلے پر کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔کیونکہ جب انسان کے پاس دلیل نہ ہو تو وہ دشنام طرازی پر اتر آتا ہے "۔

وسیم انجم: ادب میں تنقید ایک مستقل موضوع ہے۔اس کی اہمیت کے بارے میں رائے کا

اظہار کرتے ہوئے ،نقاد کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے عصر حاضر میں اچھے ناقدین کا ذکر کریں۔

حیدر قریشی:تنقید تخلیقی ادب پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔اور تخلیقی ادب سے متاثر بھی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں بے شک تنقیدی فیصلوں میں بعض گھپلے بھی ہوئے ہیں ۔لیکن عمومی طور پر اردو تنقید ٹھیک ہی جا رہی ہے۔ بہت سے نقاد اپنی بعض ترجیحات کے باوجود مجموعی طور پر اچھی تنقید لکھ رہے ہیں۔عصر حاضر کے نقادوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر جمیل جالبی، جیلانی کامران، شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ، دیویندر اسر، ڈاکٹر انور سدید، سلیم احمد، شمیم احمد، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی سے لیکر ناصر عباس نیّر تک متعدد اہم نقاد ہیں، جو کسی نہ کسی زاویے سے خاص اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔

وسیم انجم: آپ کی شاعری کو 25 سال مکمل ہو چکے ہیں اور پچیس سالہ شاعری پر کلیات بھی منظر عام پر آ چکی ہے۔ شاعری کے اس دور کو آپ کتنے حصوں میں منقسم کریں گے۔ اور اس دوران اپنے نشیب وفراز پر روشنی ڈالئے۔

حیدر قریشی: میں نے اپنے اندر کے نقاد کی مدد سے اپنی شاعری کو چار ادوار میں بانٹ کر دیکھا ہے۔اور اس کا ذکر اپنی کتاب "غزلیں ،نظمیں ،ماہیے" میں کیا ہے۔

ا۔روایتی غزل کا دور۔۲۔انتہا پسند جدیدیت کے زیر اثر غزل کہنے کا دور۔

۳۔انتہا پسند جدیدیت کے اثر سے نکلنے کا دور۔۴۔اور سابقہ تینوں ادوار کے مثبت اثرات سے مل کر بنا دور

جہاں تک نشیب وفراز پر روشنی ڈالنے کا تعلق ہے تو یہ کام تو قاری اور ناقد کو کرنا ہے۔

وسیم انجم: آپ نے آزاد نظمیں بھی تخلیق کی ہیں۔آپ کے نزدیک آزاد نظم اور نثری نظم کے مستقبل میں کیا امکانات ہیں؟ ان کی زندگی کا انحصار کن وجوہات پر ہے؟ ان دونوں کے فرق

اور باہمی تعلق پر کچھ بتلائیے۔

حیدر قریشی : آزاد نظم شاعری ہے۔لیکن نثری نظم شاعری نہیں ہے۔اس میں شعری مواد تو ہوتا ہے۔لیکن شاعری نہیں بن پاتا۔ایک خوبصورت عمارت کو اگر نظم مان لیں تو اس عمارت میں استعمال ہونے والے سارے میٹریل کا ڈھیر نثری نظم ہے۔ جب تک یہ میٹریل فن تعمیر میں صرف ہو کر اپنے وجود کا اظہار نہیں کرے گا۔تب تک صرف شعری مواد رہے گا۔شاعری نہیں بن پائے گا۔مغرب میں بے جا آزادی کے معاشرتی رجحان نے نثری نظم جیسی اصناف کو ادب کی سطح پر قبول کیا ہے۔لیکن ہم مغرب کی اندھی تقلید تو نہیں کر سکتے۔ایک حد تک ہی ان کے فیوض سے استفادہ کر سکتے ہیں۔مغرب میں شادی کے بغیر بچہ پیدا کر لینا عیب نہیں ہے۔لیکن ہمارا معاشرہ اس "خوبی" کو قبول نہیں کر سکتا۔

وسیم انجم: برصغیر پاک وہند میں کسی صنف سخن کو زیادہ پذیرائی حاصل ہے؟

حیدر قریشی:تمام تر مخالفتوں کے باوجود اردو غزل آج بھی برصغیر کی سب سے طاقتور صنف ہے۔غزل کی تحقیر کرنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو اچھی غزل کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

وسیم انجم: شاعری کے علاوہ نثر میں بھی آپ نے اچھا خاصا کام کیا ہے۔آپ کے افسانوں اور انشائیوں کو پڑھنے کے بعد متعدد شخصیات میں ڈاکٹر وزیر آغا، انتظار حسین اور بالخصوص سعادت حسین منٹو، مشتاق قمر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔آپ کن شخصیات سے زیادہ متاثر ہیں اور کیوں؟

حیدر قریشی : میری انشائیہ نگاری میں ڈاکٹر وزیر آغا کا بہت بڑا حصہ ہے۔ باقی انشائیہ نگاروں میں غلام جیلانی اصغر، انور سدید، مشتاق قمر اور اکبر حمیدی مجھے اچھے لگتے ہیں ۔شاید ان کے اثرات بھی میرے انشائیوں میں ملتے ہوں۔افسانہ نگاری میں پریم چند، کرشن چندر، راجندر

سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو کو اردو افسانے کے بھی اور اپنے بھی پیش رووں میں شمار کرتا ہوں۔
جدید افسانہ نگاروں میں مجھے جوگندر پال اور رشید امجد نے متاثر کیا ہے احمد جاوید کے اثرات بھی مجھے کہیں کہیں محسوس ہوتے ہیں۔

وسیم انجم: جب آپ نے پروفیسر مشتاق قمر کی رحلت پر حاضری کا بتلایا تو مجھے آپ کی تصویر کا عکس ماضی کے دھندلکوں میں لے گیا۔ اور میں نے پالیا کہ آپ ڈاکٹر وزیر آغا، جمیل آذر اور رشید نثار کی ہمراہی میں شامل تھے۔ پروفیسر مشتاق قمر کی نگارشات بھی آپ نے پڑھی ہوں گی ان کے فن اور شخصیت پر اپنی ملاقاتوں کے حوالے سے مفصل بات کیجیے۔

حیدر قریشی: میں مشتاق قمر کے انشائیوں اور افسانوں کا باقاعدہ قاری رہا ہوں۔ اور انہیں دونوں حیثیتوں میں پسند کرتا رہا ہوں۔ افسوس ان کی بے وقت موت نے اردو ادب کو ایک اچھے انشائیہ نگار اور اچھے افسانہ نگار سے محروم کر دیا۔ افسوس ذاتی طور پر ہماری ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ میں ان کی وفات پر تعزیت کے لیے حاضر ہوا تھا۔

وسیم انجم: ہر تخلیق کار کو اپنی تخلیق پیاری ہوتی ہے۔ اور بے حد اچھی لگتی ہے۔ آپ کی تخلیقات اردو ادب میں احسن اضافے ہیں۔ بعض تصانیف نے تہلکہ بھی مچایا ہوگا۔ آپ کس تصنیف سے زیادہ مطمئن ہیں۔ اور اس کی کیا وجوہات ہیں؟

حیدر قریشی: شاعری میری پہلی محبت ہے۔ لیکن میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کونسی صنف یا تصنیف زیادہ اچھی لگی۔ میرے لئے تو میری ہر تخلیق اور ہر تصنیف اپنی اپنی جگہ اہم ہے۔ تاہم مطمئن ہو جانے والی بات کہیں بھی نہیں ہے۔ ہر تخلیق کے بعد ذہنی اور روحانی آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن خوب سے خوب تر کی جستجو تو ہمیشہ رہے گی۔

وسیم انجم: عصر حاضر میں متعدد چھوٹے بڑے رسائل اور گروپس معرض وجود میں آ چکے ہیں۔ جن سے ادب میں مقابلے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ لیکن بعضے بلاوجہ ایک دوسرے کی ٹانگ

کھینچنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اور ان کی تنقید برائے تنقید ہی ہوتی ہے۔ اردو ادب کی تحریکوں کے تناظر میں رسائل اور ناقدین کے ماضی اور حال کے حوالے سے آپ کہاں تک مطمئن ہیں؟

حیدر قریشی: ادب میں مقابلے کا رجحان بری چیز نہیں ہے۔ لیکن یہ مقابلہ علمی اور تخلیقی سطح پر ہونا چاہیے تھا۔ افسوس ہے کہ وطن عزیز کی کرپٹ سیاست نے ادبی سیاست کو بھی کرپٹ کر دیا ہے۔ مخالفت میں ذاتیات کی سطح پر آنے کے بعد غنڈہ گردی کے مظاہرے بھی ہونے لگے ہیں۔ میں ابھی تک ادبی رسائل کی اہمیت کا معترف تھا اور اخبار کے ادبی صفحہ کو غیر ادبی چیز سمجھتا تھا لیکن اب بعض ادبی رسائل نے اپنے کردار سے، اپنے طرز عمل سے ایسے غیر ادبی رویوں کو فروغ دیا ہے کہ اس کے مقابلے میں اچھے اخبارات کے ادبی صفحے زیادہ پُر وقار اور معیاری لگنے لگے ہیں۔ اس کے باوجود بیشتر ادبی رسائل اپنا ادبی فریضہ احسن طور پر ادا کر رہے ہیں۔ اور انہیں کے دم قدم سے ادبی رسائل کا وقار بنا ہوا ہے۔

وسیم انجم: پاکستانی ادب کے حوالے سے ہمیں دوسرے ممالک کے ساتھ ادبی روابط کیسے رکھنے چاہیں۔ ان میں ہندوستان اور جرمنی وغیرھم کے حوالے سے بات کیجیے۔

حیدر قریشی: جب ہم پاکستانی ادب کی بات کریں گے تو اس میں ساری علاقائی زبانوں کا ادب بھی آ جائے گا۔ اور گفتگو کا دائرہ بہت زیادہ پھیل جائے گا۔ اردو میں پاکستانیت کی بات کریں تو پاکستانیوں کا تخلیق کردہ سارا ادب ہی پاکستانی ہے۔ ایک سطح پر یہ اپنی دھرتی کے دائرے کے اندر ہے۔ دوسری سطح پر برصغیر کے دائرے تک پھیلتا ہے۔ اور تیسری سطح پر عالمی دائرے تک جاتا ہے۔ اور ہر دائرے کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ انڈیا کے اردو ادب کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے اور اس سے لاتعلق بھی نہیں رہ سکتے۔ مغربی ملکوں سے رابطے کی ایک صورت ترجمہ ہے۔ اس میدان میں تھوڑا بہت کام ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کرسٹینا نے اردو ادیبوں کی تخلیقات کا انتخاب کر کے اس کا ترجمہ جرمن زبان میں شائع کیا تھا۔ لیکن ان کے ایک انٹرویو کے مطابق اس کتاب کا انہیں جرمن

قارئین کی طرف سے کوئی ریسپانس نہیں ملا۔سو ترجمے کا بیشتر کام بھی صرف اپنے آپ کو خوش کرنے والا ہے۔ایسی صورت میں بہتر یہ ہوگا کہ ہم اپنے ادب کو اپنی جڑوں سے منقطع نہ ہونے دیں۔ہمیں بین الاقوامیت ملے نہ ملے،اپنا آپ تو مل جائے گا۔

وسیم انجم: تحقیقی میدان میں ہندوستان ہم سے آگے ہے۔اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟۔

حیدر قریشی: تحقیقی میدان میں پاکستان میں بھی معیاری کام ہوا ہے۔تاہم اس میں شک نہیں کہ ہندوستان اس میدان میں ہم سے آگے ہے۔

وسیم انجم: شعراء وادباء کے مسائل پر بات کرنا پسند فرمائیں گے۔کیونکہ ہمارے ہاں ان کے چلے جانے کے بعد بڑے بڑے کالم لکھے جاتے ہیں۔بڑے بڑے تعزیتی ریفرنس منعقد ہوتے ہیں لیکن اکثر کی زندگی کسمپرسی میں ہی بسر ہوتی ہے۔

حیدر قریشی: شاعروں اور ادیبوں کا ذریعہ آمدنی ادب نہیں ہے۔ جسے ہم اعلیٰ معیار کا ادب کہتے ہیں اس کا تو دنیا بھر میں وہی حال ہے جو پاکستان میں ہے۔ہماری زندگیاں اگر کسمپرسی میں بسر ہوتی ہیں تو اس کی وجہ ہمارے ملک کا اقتصادی ڈھانچہ ہے۔صرف ادیب ہی نہیں لاکھوں دوسرے عوام بھی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔کم از کم ادیبوں کی سطح پر ہمارا فرض بنتا ہے کہ حکومت سے اہم اقدامات کرائے جائیں۔لیکن یہ اقدامات امداد دلانے والے نہیں بلکہ مناسب روزگار دلانے والے ہونے چاہیں۔

وسیم انجم: آپ ادبی اور معاشی لحاظ سے جو کچھ کر رہے ہیں کیا اس سے مطمئن ہیں؟

حیدر قریشی: ادبی لحاظ سے جرمنی میں بیٹھ کر مجھے جتنا کام کرنے کی توفیق مل رہی ہے۔اس پر میں اپنے خدا کا بے حد شکر گزار ہوں۔معاشی لحاظ سے صورت حال یہ ہے کہ میری ملازمت سے مجھے جو تنخواہ ملتی ہے اس سے ہمارے گھر کا کرایہ بھی ادا نہیں ہوتا لیکن یہاں کے فلاحی قوانین

کے مطابق میرے خاندان کی کم از کم ضروریات کی بقایا رقم حکومت خود ادا کرتی ہے۔سو یہ میرے لئے اطمینان بخش نہیں ہے۔میں چاہتا ہوں کہ یا تو جلد ہی سارے بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔پھر میری تنخواہ ہم میاں بیوی کے لیے مناسب رہے گی۔یا پھر مجھے کوئی اور بہتر ملازمت مل جائے جس سے میں اپنے خاندان کی کفالت خود کر سکوں۔

وسیم انجم: حیدر قریشی صاحب! آخری سوال کی جسارت کر رہا ہوں۔آپ اپنے معترفین و معترضین کے لیے پیغام دینا پسند فرمائیں گے؟

حیدر قریشی: میرے معترفین؟۔۔۔۔بھائی! آپ جیسے چند دوست ہیں جن کی محبت مجھے حوصلہ دیئے رکھتی ہے۔پیغام تو ان کے لیے کوئی نہیں ہے بس یہ دعا ہے کہ خدا ان ساری محبتوں کو قائم رکھے۔جہاں تک معترضین کا تعلق ہے ان کی چند قسمیں ہیں۔

۱۔وہ احباب جو ادبی اختلاف رکھتے ہیں اور مہذب ادبی زبان میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔انہیں میں معترض ہونے کے باوجود محبت کرنے والے دوستوں میں ہی شمار کروں گا۔کیونکہ یہ اختلاف کرتے ہیں تو میرے اختلاف کو برداشت کرنے کا ظرف بھی رکھتے ہیں۔

۲۔وہ احباب جو خود تو اختلاف کرتے ہیں لیکن جب انہیں علمی طور پر جواب دیا جاتا ہے تو کسی بہتر نتیجہ پر پہنچنے کی بجائے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور پھر خود پس پردہ رہ کر دوسرے لوگوں سے ذاتی حملے کراتے ہیں۔

۳۔وہ احباب جو کسی ذاتی رنجش کے باعث مجھ سے خفا ہوتے ہیں اور پھر اسے ادبی مسئلہ بنانے لگ جاتے ہیں۔

ان دونوں طرح کے دوستوں کے ساتھ میں نے بھی ایک حد تک لڑائی لڑی ہے میری تہذیب مجھے ایک حد سے آگے نہیں جانے دیتی۔اس لیے میں ایسے دوستوں کا غیر علمی اور ذاتی لڑائی کے مقابلے میں زیادہ دیر تک ساتھ نہیں دے سکا۔تاہم ان سب نے میرے ساتھ جو کچھ کیا میں اس پر

بھی شرمندہ ہوں اور میں نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا اس پر بھی شرمندہ ہوں۔ میری دعا ہے کہ ہمارے ادیب ادبی مسائل پر شخصیات کو نشانہ بنانے کی بجائے مسائل پر علمی سطح پر بات کرنے کے قابل ہو جائیں۔

۴۔ چوتھی قسم ان احباب کی ہے جو دوسروں کی کارکردگی دیکھ کر حسد کرتے ہیں۔ میرے معترضین کی ایک بڑی تعداد ایسے حاسدین پر مشتمل ہے ان کے لیے میں اس قرآنی دعا کا وِرد کرتا رہتا ہوں۔

و من شر حاسد اً اذا حسد

وسیم انجم: حیدر قریشی صاحب! آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے میرے متعدد سوالات پر سیر حاصل گفتگو فرمائی جس سے آپ کے فکری وفنی گوشے منور ہوئے اور یقیناً ناقدین کی تشفی بھی ہوئی ہوگی۔

حیدر قریشی: محمد وسیم انجم بھائی! یہ صرف آپ کی محبت ہے جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

☆☆☆

(بحوالہ کتاب ''حیدر قریشی فکر وفن''از: محمد وسیم انجم
انجم پبلشرز۔ کمال آباد نمبر ۳۔ راولپنڈی۔ مطبوعہ اگست ۱۹۹۹ء)

حیدر قریشی سے بذریعہ انٹرنیٹ انٹرویو

اختر رضا سلیمی

سوال: آپ کب سے لکھ رہے ہیں؟

جواب: ۱۹۷۱ء میں پہلی غزل کہی تھی۔ ویسے چھوٹی موٹی تک بندی تو اسکول کے زمانے سے جاری تھی۔

سوال: پہلی مطبوعہ تحریر؟

جواب: ہفت روزہ ''لاہور'' کے غالباً مئی ۱۹۷۲ء کے کسی شمارہ میں وہ غزل شائع ہوئی، جو میں نے ۱۹۷۱ء میں کہی تھی۔

سوال: جب ''اوراق'' لاہور کے ذریعے ماہیے کے درست وزن کی نشاندہی کی گئی تو آپ نے اسے ایک تحریک کی صورت دی۔ ابتدا میں آپ کے موقف کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ کیا آپ کو یقین تھا کہ مستقبل قریب میں آپ کے موقف کو پذیرائی ملے گی؟

جواب: میرے ذہن میں صرف اتنی سی بات تھی کہ ماہیے کے بارے میں بے خبری کے باعث جو ایک چھوٹی سی غلطی راہ پا گئی ہے اس کی نشاندہی ہونے پر ماہیا نگار حضرات اسے خوشدلی سے درست کرلیں گے۔ اسی لئے میں نے ماہیے کی لے کو مدِ نظر رکھ کر ماہیے کہنے شروع کئے۔ ساتھ ہی احباب پر ماہیے کا وزن واضح کرنا شروع کیا۔ میرے گمان میں تو یہ بھی نہیں تھا کہ ایک سیدھی سی بات کہنے پر مجھے اتنا برا بھلا کہا جائے گا اور اس قدر مخالفت کی جائے گی۔ بس جیسے ہی مخالفت

شروع ہوئی ہمارے موقف کو پذیرائی ملنا شروع ہوگئی۔آپ کو مزے کی ایک بات بتاؤں۔مجھے یارلوگوں کی بے جا مخالفت پر حیرانی تھی۔اسی دوران ڈاکٹر انورسدید ایبٹ آباد آئے۔میں نے بڑی سادگی کے ساتھ اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ یار لوگ سیدھی سی بات کو سمجھ ہی نہیں رہے۔تب ڈاکٹر انورسدید نے مسکرا کر کہا ادب میں ایسے ہی ہوتا ہے۔پھر انہوں نے مشورہ دیا کہ مخالف کو مخالفت کرنے دیں۔آپ اپنے موقف کو مضامین کے ذریعے پیش کرنا شروع کردیں۔سو مضامین لکھنے کے سلسلے میں ڈاکٹر انورسدید کا مشورہ بے حد مفید رہا۔بعد میں جب ''تخلیق''لاہور میں میری شدید مخالفت کی گئی تب میں نے اپنی تائید میں دوسرے مقتدر ادباء کے ساتھ انورسدید کی تحریروں کے حوالے بھی دیئے تو مجھے یہ دیکھ کر پہلے تو حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر انورسدید جیسے''حق گو نقاد''نے اپنے لکھے کا دفاع کرنے کی بجائے''معنی خیز''خاموشی اختیار کرلی۔لیکن اب سوچتا ہوں کہ ادب کے تئیں ایک تو ان کی ترجیحات بدل چکی ہیں اور وہ زیادہ وقت صحافت کو دے رہے ہیں دوسرے یہ کہ غالباً وہ مجھ میں خوداعتمادی پیدا کرنے کے لئے مجھے اکیلے ہی مخالفین کا سامنا کرنے دینا چاہ رہے تھے۔سو مجھے تو مخالفت کا بھی گمان نہ تھا۔اور یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میری اتنی شدید مخالفت نہ ہوتی تو ماہیے کو ایسی پذیرائی نہیں ملتی۔

سوال: کسی سلسلے میں جب آدمی کی مخالفت ہونے لگتی ہے تو وہ سوچتا ہے کہ میں نے مفت کی درد سری مول لے لی ہے۔آپ نے جب ماہیے کے درست وزن کی تحریک کا بیڑہ اٹھایا تو ہر طرف سے آپ کی مخالفت شروع ہوگئی۔آپ کو اس وقت کبھی ایسا خیال آیا؟

جواب: جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مخالفت پر مجھے بڑی حیرانی ہوتی تھی کہ اتنی سیدھی سی بات' بالکل سامنے کی بات لوگوں کو سمجھ میں کیوں نہیں آرہی!لیکن وقت کے ساتھ ساتھ دنیا کے رنگ ڈھنگ واضح ہوتے گئے اور ادبی زندگی' جینے کا طریقہ بھی سمجھ میں آتا گیا۔کبھی کبھی یہ خیال ضرور آتا ہے کہ ماہیا میری پہلی ترجیح نہیں ہے لیکن مجھے اسی میں زیادہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔لیکن پھر

یہ بھی سوچتا ہوں کہ کوئی ادبی صلاحیت ملنا' اسے بروئے کار لانے کی توفیق ملنا اور پھر اس کا مثمر بہ ثمرات ہونا سب خدا تعالیٰ کی مہربانی سے ہوتا ہے۔سو اگر وہ مجھے اس میدان میں زیادہ کام کرنے کی ہمت اور توفیق دے رہا ہے تو میں اس پر بھی اس کا شکر گزار ہوں۔

سوال: ماہیے کے وزن کے حوالے سے کچھ لوگوں نے ابتدا میں آپ کے موقف کی حمایت کی لیکن جلد ہی وہ آپ کے موقف کی مخالفت کرنے لگ گئے۔اس تبدیلی کی کوئی خاص وجہ؟

جواب: بعد میں مخالفت کرنے والوں میں ماہیا نگار تو صرف ایک ہی ہیں لیکن انہوں نے بھی جتنے ماہیے کہے ہیں' مخالفت کرنے کے باوجود ہمارے موقف کے مطابق ہی کہے ہیں۔لہٰذا ان کی مخالفت کا سبب از خود ظاہر ہے۔باقی جن ایک دو دوستوں نے موقف تبدیل کرنے کی کوشش کی میں نے بروقت ان کی نشاندہی شواہد کے ساتھ کردی۔میری کتاب''اردو ماہیے کی تحریک''میں ان کا مکمل حوالہ موجود ہے۔وہ اس سے آگے بات کریں تو میں مزید وضاحت کرنے کو تیار ہوں۔انہوں نے کسی ذاتی رنجش میں ہی موقف تبدیل کیا تھا۔تاہم ہمارا موقف کسی فرقے کا عقیدہ نہیں ہے کہ اس سے اختلاف کرنے والوں کو مرتد قرار دے دیا جائے' یا ان کی مخالفت پر کمر کس لی جائے۔فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ہاں جب ہم پر حملہ ہوگا تب ہم اپنا دفاع ضرور کریں گے۔

سوال: آپ نے ماہیے کی سہ مصرعی ہیئت پر اصرار کیا حالانکہ پنجابی میں دونوں ہیئتیں (ڈیڑھ مصرعی اور سہ مصرعی) ملتی ہیں؟

جواب: پہلے تو یہ وضاحت کردوں کہ اب تک کی تحقیق کے مطابق پنجابی میں ماہیے کی دو نہیں بلکہ تین تحریری صورتیں ملتی ہیں۔ایک یک سطری' دوسری ڈیڑھ سطری اور تیسری سہ مصرعی۔اور یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ میں نے سہ مصرعی ہیئت پر اصرار کیا ہے۔آپ میری کتاب''اردو ماہیے کی تحریک''میں شامل میرے مضامین''اردو ماہیے کی تحریک''اور''پنجابی لوک گیت ماہیے کی

تحریری ہیئت'' دیکھ لیں اور ''اوراق'' شمارہ جولائی اگست ۱۹۹۹ء میں شامل میرا مضمون ''ماہیے کی بحث'' بھی دیکھ لیں۔ میں نے کہیں بھی اصرار نہیں کیا لیکن سہ مصرعی ہیئت کو پنجابی میں بھی اور اردو میں بھی ماہیے کی مقبول صورت ضرور لکھا ہے۔ اپنے لکھے کو یہاں دہرا دیتا ہوں:

''پنجابی ماہیے کا بطور لوک گیت مجموعی وزن یہی بنتا ہے فعلن فعلن فعلن/فعلن فعلن فع/فعلن فعلن فعلن (دوسرے متبادل اوزان میں بھی اسی طرح ایک سبب کی کمی رہے گی) اب اسے چاہے ایک مصرعہ بنا کر لکھ لیں، ڈیڑھ مصرعے بنا کر لکھ لیں یا تین مصرعوں کی مقبول صورت کو اپنا لیں۔ ماہیے کا مجموعی وزن بہرحال وہی رہے گا جو ماہیے کی لَے کے مطابق ہے۔ مجھے ڈیڑھ مصرعی ہیئت پر کوئی اعتراض نہیں ہے تاہم اب بصری لحاظ سے سہ مصرعی ماہیا زیادہ اچھا لگتا ہے۔۔۔۔۔سو اب ماہیے کی تحریک جس مقام پر آ گئی ہے، یہاں ڈیڑھ مصرعی ہیئت کو غلط کہے بغیر میں یہ ضرور کہوں گا کہ سہ مصرعی صورت میں ماہیا زیادہ ہرا بھرا لگتا ہے''۔ تو جناب میں تو تینوں ہیئت میں ماہیے کو مانتا ہوں لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ اس سے ماہیے کے وزن میں نقب نہ لگائی جائے۔ ہیئت کو ''چور دروازہ'' بنا کر ماہیے کی لوک لَے سے الگ نہ کیا جائے۔ ویسے ڈیڑھ مصرعی ہیئت پر بے جا اصرار کرنے والوں سے میں نے ''اوراق'' کے مذکورہ شمارہ میں یہ سوال کئے تھے کہ وہ لوگ اس وقت کہاں تھے جب پنجابی کے مقتدر دانشور سہ مصرعی ہیئت میں ماہیے کی کتابیں مرتب کر کے چھاپ رہے تھے اور یہ سارے کام مقتدر سرکاری ادبی اداروں کی نگرانی میں ہوئے تھے؟ اور اس وقت یہ لوگ کہاں تھے جب ۱۹۸۳ء سے مساوی الوزن ''ماہیے'' کہنے والے سہ مصرعی فارم میں ماہیے کہہ رہے تھے؟ تا دمِ تحریر نہ ان مقتدر پنجابی دانشوروں کو کسی نے برا بھلا کہا ہے، نہ مساوی الوزن سہ مصرعی ''ماہیے'' کہنے والوں کو کسی نے میلی نظر سے دیکھا ہے؟ سو اب میرا سوال یہ ہے کہ ڈیڑھ مصرعی فارم کا شوشہ چھوڑنے والوں کے تیروں کا رُخ صرف ہماری ہی طرف کیوں ہے؟ جن اہم پنجابی دانشوروں نے پنجابی ماہیے کی سہ مصرعی فارم والی کتب مرتب کی ہیں اور جن

اردو کے مساوی الوزن ''ماہیا نگاروں'' نے اب تک یہی فارم اختیار کر رکھی ہے انہیں کیوں بچا لیا جاتا ہے؟ اور صرف ہم پر ہی کیوں ''نظرِ کرم'' فرمائی جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب مخالفین کو ہر سطح پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تب جان بوجھ کر سہ مصرعی فارم کا شوشہ چھوڑنے کے لئے بندے چھوڑے گئے۔ یہ واضح حقیقت ہے۔

سوال: آپ کے بقول ماہیا وہی ہے جس کے دوسرے مصرعے میں ایک سبب کم ہو۔ بشیر سیفی 'ارشد محمود ناشاد اور ان کے ہم نواؤں کا کہنا ہے کہ پنجابی میں نہ صرف مساوی الوزن ماہیے موجود ہیں بلکہ دوسرے مصرعہ میں ایک سبب زائد والے ماہیے بھی موجود ہیں؟

جواب: دراصل انہوں نے میرے مضامین کو دھیان سے نہیں پڑھا۔ اس لئے میری کہی ہوئی ایک بات کو آدھا لے اُڑے ہیں۔ میری کتاب ''اردو ماہیے کی تحریک'' کے صفحہ نمبر ۱۳۱، ۱۳۲ کو پڑھ کر دیکھیں۔ میں نے نشاندہی کی ہے کہ پنجابی ماہیے میں صرف مساوی الوزن اور دو حرف کم یا زائد والے ہی نہیں بلکہ چار حرف کم یا زائد والے ماہیے بھی ملتے ہیں۔ ایسی صورت میں تو ماہیے کی یہ پانچوں ہیئت رائج کر لینی چاہئیں۔ لیکن ایسا غدر اسی صورت میں ہو گا جب آپ پنجابی ماہیے کو اردو عروض کے مطابق دیکھیں گے لیکن اگر آپ ماہیے کی لَے کو بنیاد مان لیں تو پھر نہ کوئی کنفیوژن رہتا ہے نہ کوئی غدر مچتا ہے۔ بشیر سیفی تو بہت بہادر آدمی ہیں میرے لکھے کو اپنا موقف بنا کر پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی میری مخالفت بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے ماہیے کی دُھن والے میرے موقف کو بڑے مزے سے اپنا موقف بنا کر بیان کر دیا اور ساتھ ہی میری مذمت بھی فرمادی۔

؎ جو میرے لکھے سے استفادہ بھی کر رہا ہے۔۔۔۔ خلاف باتیں وہی زیادہ بھی کر رہا ہے

سوال: آپ نے ماہیے کو پابندِ لَے گردانا ہے۔ اُدھر مساوی الوزن ماہیے کے حامیوں کا کہنا ہے کہ دوسرے مصرعے میں ایک سبب کی کمی والا ماہیا لَے میں فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس تضاد نے ماہیے

کے قارئین کو الجھا کر رکھ دیا ہے؟ آپ اپنے موقف کی وضاحت فرمائیں گے؟

جواب: میرے علم میں نہیں ہے کہ کس نے ایسی بات کہی ہے۔لیکن جس نے بھی یہ کہا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں ایک سبب کم والا ماہیا لے پر فِٹ نہیں بیٹھتا'اس نے بڑی ہی بچکانہ بات کی ہے۔۱۹۳۶ء سے اب تک اردو ماہیے کے گائے گئے جتنے نمونے دستیاب ہوئے ہیں سب کے سب ہمارے موقف کی تصدیق کرتے ہیں۔ہمت رائے شرما'قتیل شفائی'قمر جلال آبادی'ساحر لدھیانوی'نذیر قیصر'وپن ہانڈا تک فلمی ماہیا نگاروں کے کم از کم سات نمونے تو میں خود پیش کر چکا ہوں۔یہ سارے ماہیے' پنجابی لَے کے مطابق لکھے اور گائے گئے ہیں اور انہیں لکھنے والا ہر شاعر ہمارے موجودہ موقف سے بے تعلق تھا اس کے باوجود ہمارے موقف اور ان کے ماہیوں میں جو تعلق ہے وہ صاف ظاہر ہے۔مجھے تو وہ صاحب کوئی بہت بھولے بھالے لگتے ہیں جنہوں نے ایسی بات کہہ دی۔باقی ماہیے کے سلسلے میں جتنا الجھاوا پیدا کیا جا رہا ہے وہ صرف معترضین اپنے آپ کو اور ایک دوسرے کو خوش کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔جہاں تک ماہیا نگاروں اور ماہیے کے عام قاری کا تعلق ہے وہ ماہیے کو بخوبی جان چکے ہیں۔معترضین کو بخوبی علم ہے کہ ماہیا نگاران کی بات کو نظر انداز کر کے درست وزن کے ماہیے کہہ رہے ہیں۔اور قارئین بھی حقیقت سے آگاہ ہیں۔

سوال: اردو ماہیے پر وزن اور ہیئت کے حوالے سے تو خاصی بحث ہو چکی ہے لیکن اس کے مزاج کو کسی نے درخورِ اعتنا نہیں جانا حالانکہ ماہیے کا اپنا ایک مخصوص مزاج بھی ہے۔اس پر بھی تو بحث ہونی چاہئے؟

جواب: مزاج کے حوالے سے تھوڑا بہت کام تو ہوا ہے لیکن یہ درست ہے کہ اس پر مزید کام کی ضرورت ہے۔تاہم ضروری ہے کہ ماہیے کے مزاج پر بات کرنے والا پنجابی ماہیے کو اس کے ہر پہلو سے کسی نہ کسی حد تک ضرور جانتا ہو۔یہاں مجھے ایک ''نقاد'' یاد آ گئے۔موصوف مجھ پر اس لئے

بگڑ گئے کہ میں نے ماہیے کے ڈانڈے ہندی گیت کے ساتھ ریختی جیسی فحش صنف سے کیوں ملا دیئے حالانکہ پنجابی ماہیے میں حمد و نعت سے لے کر فحش گوئی تک ہر موضوع پر ماہیوں کا ذخیرہ موجود ہے۔بندے نے صرف تنویر بخاری کے مرتب کردہ انتخاب ہی کو پڑھ رکھا ہو تو وہ ایسے بچکانہ اعتراض سے بچ سکتا ہے۔سو ماہیے کے مزاج پر بات کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے پنجابی ماہیے کو ہمت کر کے ہر پہلو سے دیکھ اور سمجھ لیں۔

سوال: گزشتہ دس سالوں میں اردو ماہیے کو بے حد پذیرائی ملی'جس میں آپ کی کوششوں کا عمل دخل سب سے زیادہ ہے اور اب تو حیدر اور ماہیا لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔آپ کو کیسا لگتا ہے؟

جواب: اچھا لگتا ہے لیکن یہ بھی ہے کہ محض اس چکر میں بعض اچھے دوست گنوا بیٹھا ہوں۔حامد سروش اور سیدہ حنا سے میری بہت اچھی دوستی تھی وہ ہاتھ سے گئی۔بشیر سیفی سے گہری دوستی نہ سہی لیکن اچھی ہائے ہیلو تھی۔ماہیے کی بحث میں ان کے آنے سے پہلے انہیں مجھ سے ایک دوستانہ سی شکایت ہوئی تھی۔میں اسے دور کرنا چاہ رہا تھا لیکن اس سے پہلے ہی انہوں نے اپنی کاروائی شروع کر دی۔سو اچھا لگنے کی خوشی کے ساتھ ہلکا سا تاسف کا احساس بھی ہے۔

سوال: کوئی بھی صنف سخن ہو ارتقائی مراحل بتدریج طے کرتی ہے۔کسی بھی صنف سخن کو پنپنے میں خاصا وقت لگتا ہے لیکن ماہیا اچانک آیا اور چھا گیا۔اس کے اسباب پر روشنی ڈالیں گے؟

جواب: میرے ذہن میں اس کے دو اسباب آتے ہیں۔ہو سکتا ہے اور اسباب بھی سامنے آئیں۔پہلا سبب تو یہ کہ اردو میں کسی سہ مصرعی صنف کی جستجو بڑھ گئی تھی۔ثلاثی'ہائیکو اور ترو ینی جیسی سہ مصرعی اصناف شاعری میں کسی سہ مصرعی صنف کی جستجو کا احساس دلاتی ہیں۔ان سب کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے۔تاہم ان میں سے کوئی بھی شاید ثقافتی سطح پر جُڑ نہیں پا رہی تھی۔ان کے برعکس ماہیا تو یہاں کی ثقافت میں رچا ہوا تھا سو جیسے ہی سہ مصرعی صنف کی طلب کو ماہیا ملا'ماہیا مقبول ہو گیا۔دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ حالیہ دس برسوں میں جتنی ماہیے کی مخالفت ہوئی ہے کسی اور

ادبی اشو پر اتنی کسی کی مخالفت نہیں ہوئی اور یہ تو ہوتا ہے کہ جس چیز کی زیادہ مخالفت ہو لوگ اس میں زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں۔سو ماہیے کے مخالفین نے بھی اس کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ لوگوں کو اس طرف متوجہ کر دیا ہے۔ باقی لوگ خود سیانے ہیں' دونوں موقف جاننے کے بعد خود ہی بہتر فیصلہ کر لیتے ہیں سو اس لئے بھی ماہیا مقبول ہوا ہے۔

سوال:بعض نقاد تو یہ خدشہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ماہیا اگر طوفان کی صورت آیا تو جھاگ کی صورت بیٹھ بھی جائے گا یعنی ماہیا کا کوئی مستقبل نہیں؟

جواب: دنیا جس ڈگر پر جا رہی ہے مجھے تو اس سے ادب کے مستقبل پر بھی تشویش ہونے لگتی ہے۔ جہاں تک ماہیے کا تعلق ہے ہم نے اپنی توفیق کے مطابق کام کیا ہے۔اور ہمارے کام سے زیادہ خدا نے پھل پھول لگا دیئے ہیں۔ اردو میں کتنی اصناف کبھی بے حد مقبول تھیں اب ان کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے۔اس کے باوجود ادب کی ترویج کی تاریخ میں ان اصناف کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔سو ماہیے نے تو اتنے مختصر سے عرصہ میں اپنے لئے ایک اہم جگہ بنا لی ہے۔اس لئے مجھے اس کے مستقبل کے حوالے سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ویسے آپ دیکھیں تو اس قسم کا پروپیگنڈہ وہ لوگ کر رہے ہیں جو ماہیے کی بحث میں علمی لحاظ سے ہر سطح پر شکست کھا چکے ہیں اور اپنے دل کے بہلانے کے لئے نجومی بابا بن رہے ہیں۔

سوال:بعض لوگ کہتے ہیں کہ حیدر نے ماہیے کو سستی شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا ہے؟

جواب:اگر میرے مجموعی ادبی کام کے تناظر میں دیکھا جائے تو ماہیے کے چکر میں میرا دوسرا کام کسی حد تک نظر انداز ہوا ہے۔اپنی غزلوں' اپنے خاکوں اور افسانوں' اپنے سفر نامے اور ''کھٹی میٹھی یادوں'' کے حوالے سے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں لیکن میں ایمانداری سے محسوس کرتا ہوں کہ ماہیے کی بحث میں میرا وہ سارا کام پس پشت چلا گیا ہے۔سو ماہیے کی شہرت مجھے سستی نہیں مہنگی پڑی ہے۔ پھر اوپر سے یار لوگوں کی ملامت۔ جو بھی علمی سطح پر لاجواب ہوا اس نے شخصی دشمنی

قائم کر لی۔ جہاں چور اور بے وزن شاعروں اور افسانہ نگاروں کو آسمان پر چڑھا دیا گیا وہاں حیدر قریشی کے لئے زمین پر رہنے کا حق بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔سو ماہیے والی شہرت سے تنویر سپرا مرحوم کا ایک شعر یاد آ گیا ہے

عزت بڑھی تو ساتھ ہی رُسوائی بڑھ گئی۔۔۔تنخواہ کے حساب سے مہنگائی بڑھ گئی

ویسے آپ دیکھیں کہ جن لوگوں کی ادب میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی وہ صرف اس لئے اہم ہو گئے کہ وہ ماہیے کے مخالف ہیں۔تو ماہیے نے تو اپنے مخالفوں کو بھی شہرت عطا کر دی ہے۔

سوال:ابتدا میں ماہیے لکھنے والے محدود تھے تو ماہیوں کا معیار بلند تھا لیکن جوں جوں ماہیے لکھنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی معیار کم ہوتا گیا اور اب تو بقول شخصے اچھا ماہیا ڈھونڈنا پڑتا ہے؟

جواب: پہلی بات تو یہ کہ جس صنف میں بھی زیادہ لکھنے والے ہوں گے اس میں غیر معیاری میٹر اتنا ہی زیادہ ہو گا۔سو یوں صرف ماہیے کو مطعون کرنا ٹھیک نہیں ہے معیار کی صورتحال تو ہر مقبول صنف میں تقریباً ایک جیسی ہے۔باقی یہ رسائل کے مدیران پر بھی منحصر ہے کہ وہ کس معیار کی تخلیقات قبول کرتے ہیں۔''جدید ادب'' کے دونوں شمارے اٹھا کر دیکھ لیں اور ان میں شامل ماہیوں کے معیار پر مجھ سے بات کر لیں۔''اردو دنیا'' جرمنی میں چھپنے والے ماہیوں کا عمومی معیار بھی بہت عمدہ ہوتا ہے۔پھر آپ ''اوراق'' میں چھپنے والے ماہیوں کے عمومی معیار کو دیکھ لیں۔''کوہسار'' بھاگل پور اور ''اسباق'' پونہ میں بھی عام طور پر معیاری ماہیے چھپتے ہیں۔ ''نیرنگِ خیال'' کا ماہیا نمبر معیار کے لحاظ سے بھی ایک عمدہ نمبر ہے۔چھوٹی موٹی استثنائی مثالیں تو درگزر کرنا پڑتی ہیں۔ویسے آپ یہ بھی دیکھیں کہ ایسی بات کہنے والے وہ لوگ تو نہیں جو علمی میدان میں ہر سطح پر مار کھانے کے بعد کبھی نجومی بننے لگے ہیں اور کبھی ماہیے کے معیار پر برہمی دکھانے لگے ہیں۔میرے ماہیوں کو بھی اب تو برا بھلا کہا جانے لگا ہے۔بہر حال جیسے کسی کو خوشی ملتی ہے خوش رہے!

سوال: آپ نے تو ماہیے پر تخلیقی،تحقیقی وتنقیدی تینوں سطحوں پر کام کیا ہے۔آپ کے علاوہ چند ایسے نام جنہوں نے تحقیقی وتنقیدی سطح پر کام کیا ہو؟

جواب: تحقیقی سطح پر مربوط کام تو دوسرے دوستوں نے بہت کم کیا ہے تاہم میری تحقیق میں بہت سارے دوستوں نے ایسا میٹر تلاش کرنے میں میری مدد کی جس سے میری تحقیق کو ٹھوس بنیاد ملی۔ایسے دوستوں میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی،احمد حسین مجاہد اور عارف فرہاد کے نام خاص طور پر لوں گا۔ہمت رائے شرما جی نے بھی بے حد اہم نوعیت کے میٹر کی فراہمی میں میری بہت مدد کی۔ویسے ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما جی کی دریافت ڈاکٹر مناظر عاشق کا تحقیقی کارنامہ ہے۔مجھے اس پر بعد میں مربوط کام کرنے کی توفیق ملی۔جہاں تک تنقید کا تعلق ہے اسے دو خانوں میں بانٹ لیں۔ماہیے کی پہچان کرانے میں گہرے عروضی حوالے سے آصف ثاقب،احمد حسین مجاہد،ناوک حمزہ پوری،شارق جمال،اسلم حنیف،ڈاکٹر مناظر عاشق اور بعض دیگر دوستوں نے اپنی اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق کام کیا ہے۔جبکہ ماہیے کے وزن اور ثقافتی پہچان کے حوالے سے سعید شباب،امین خیال،ناصر عباس نیر،ڈاکٹر انور سدید،گوہر شیخ پوری،کے بعض مضامین خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ماہیے کی عمومی بحث اور ماہیا نگاروں کی ماہیا نگاری پر تجزیاتی یا تعارفی مضامین کو ماہیے کی عملی تنقید میں شمار کرنا چاہئے۔اس میدان میں ڈاکٹر جمیلہ عرشی،فراز حامدی،ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی،اکبر حمیدی،ہارون الرشید،عارف فرہاد،اختر رضا کیکوٹی،محمد وسیم انجم،ناصر نظامی،سعید شباب،اور متعدد دیگر نام ہیں جو لگن اور خلوص کے ساتھ ماہیے کی عملی تنقید میں اپنی اپنی توفیق کے مطابق کام کر رہے ہیں۔خوشی کی بات یہ ہے کہ ماہیے کی تنقید کے حوالے سے ماہیا نگاروں نے نہ سکہ بند نقادوں کا انتظار کیا،نہ کسی کے بارے میں گلے شکوے کئے،نہ کسی کو طعنے دیئے،ادب کے اس عمومی رویے کے برعکس ماہیا نگاروں نے اپنے تنقید نگاروں کا کارواں بھی خود ہی تشکیل دیا اور سارا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا۔

سوال: آپ نے ایک جگہ ماہیے کو ”کتابِ دل“ کہا ہے۔اس کی وضاحت کریں گے؟

جواب: یار!یہ تو سیدھی سی بات ہے اس کی کیا وضاحت کروں۔دل اور دماغ کی تفریق کو ذہن میں رکھیں اور پھر کتابِ دل پر غور کریں۔ماہیا گہری فکر کے مقابلہ میں قلبی کیفیات کی زیادہ بہتر طور پر عکاسی کرتا ہے۔دل کی باتیں دوسرے دل میں بھی جلد ہی اتر جاتی ہیں۔دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ماہیا اپنے اظہار کی سادگی اور بیانیہ میں ہی لطافت پیدا کر دکھاتا ہے۔

سوال: کیا ماہیا عشقیہ مضامین کے علاوہ دیگر موضوعات کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا؟

جواب: پنجاب کے بیشتر لوک گیت کسی خاص خاص علاقے میں زیادہ مقبول ہیں۔ماہیا واحد لوک گیت ہے جو پنجاب کے ہر علاقے سے لے کر صوبہ سرحد کے ہندکو اور کشمیر کے گوجری علاقہ تک یکساں مقبول ہے اور اس مقبولیت کا ایک سبب یہ ہے کہ ماہیا زندگی کے ہر شعبہ کا احاطہ کرتا ہے۔زندگی کا کوئی ایسا رُخ نہیں جو ماہیے کا موضوع نہ بنا ہو۔محبت سے سیاست تک ہر موضوع ماہیے کا موضوع رہا ہے۔جب پنجابی ماہیے میں سارے موضوعات پر ماہیے ملتے ہیں تو اردو ماہیے کے لئے بھی سارے موضوع روا ہیں۔البتہ اس میں اردو ماہیا نگاروں کو یہ احتیاط کرنا پڑے گی کہ موضوع کے ساتھ اس کے مزاج کو بھی ملحوظ رکھیں۔اس وضاحت کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کہ ماہیے کا غالب موضوع محبت ہی ہے۔اس لحاظ سے ماہیے کو غزل کا ہم مزاج کہہ سکتے ہیں کہ غزل کا غالب موضوع بھی محبت ہے جبکہ غزل میں بھی سارے موضوع برتے جا سکتے ہیں۔سو ماہیے میں بھی ایسا کیا جا سکتا ہے،بس برتاؤ کا سلیقہ آنا چاہئے۔

سوال: انوار فیروز کے نام ایک خط میں آپ نے ماہیے سے ملتی جلتی ایک جرمن لوک صنف کا ذکر کیا تھا اس میں اور ماہیے میں کیا مماثلتیں ہیں؟

جواب: میں ”کوہسار“ بھاگلپور میں چھپنے والے اپنے مضمون ”مزید۔۔۔کچھ ماہیے کے بارے میں“ اس کا ذکر کر چکا ہوں۔یورپ بھر میں کارنیوال کا جو جشن منایا جاتا ہے اس میں صرف جرمنی

میں ''Bütten reden'' ضرور ہوتی ہے۔ مجھے اس کا علم ارشاد ہاشمی صاحب چیف ایڈیٹر ''اردو دنیا'' کے ذریعے ہوا تھا۔اس شاعری کی کھوج لگائی تو پتہ چلا کہ اس میں مصرعوں کی تعداد مختلف ہوتی رہتی ہے تاہم جو Bütt سہ مصرعی یا ڈیڑھ مصرعی ہیں وہ حیرت انگیز طور پر ماہیے سے مشابہت رکھتے ہیں۔کارنیوال کے موقعہ پر پڑھی جانے والی یہ شاعری صرف اور صرف طنز و مزاح پر مشتمل ہوتی ہے۔اسے حسنِ اتفاق کہئے کہ پنجابی ماہیے میں بھی طنزیہ اور مزاحیہ ماہیوں کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔میں اس مشابہت پر کام کرنا چاہتا ہوں لیکن ابھی جاب کی مصروفیت' گھریلو ذمہ داریاں اور پہلے سے موجود ادبی ذمہ داریاں اس کی مہلت ہی نہیں دے رہیں۔یہاں ایک Bütt ترجمہ کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ترجمہ ارشاد ہاشمی نے کیا ہے:

Burgermeister ist sehr schlau۔۔۔۔۔۔۔افسر وہ سیانا ہے
Wen viel zu tun ist۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کام کا زور ہو تو
Macht er oft Blau۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کر لیتا بہانہ ہے

ارشاد ہاشمی نے جرمن زبان میں ایک ماہیا کہا ہے۔اسے جرمن میں پہلا ماہیا کہا جا سکتا ہے لیکن جرمن احباب اسے پڑھ کر شاید Bütt قرار دیں:

Es gibt nicht zu lachen
Ausländer Kommen
Hier muß sauber machen

سوال: ماہیے پر آپ کی اگلی کتاب کونسی آ رہی ہے؟

جواب: میں نے ''ماہیا۔۔۔علمی بحث سے غوغائے رقیباں تک'' کا بیشتر کام مکمل کر لیا ہے۔لیکن اسے چھپوانے میں مجھے ابھی تھوڑا تامل ہے۔مجھے ہلکا سا احساس ہے کہ شاید میری مخالفت میں ظلم کی حد تک چلے جانے والے دوستوں کو کسی مرحلے پر اپنی زیادتی کا احساس ہو جائے۔اس کے تھوڑے سے آثار ایک دو طرف سے دکھائی بھی دیئے ہیں۔سو اگر متعلقہ دوست

سکوت اختیار کرتے ہیں تو میں اس کتاب کی اشاعت ہی روک دوں گا تاکہ جو ہو چکا اس پر مٹی ڈال دی جائے۔لیکن اگر یہ صرف ایک دھوکا ہوا تو پھر مجھے مجبوراً وہ سارا ریکارڈ کتابی صورت میں محفوظ کرنا ہوگا۔سرِ دست میں ماہیے کے حوالے سے اپنی تین کتابیں ترتیب دے رہا ہوں۔۱۔ماہیوں کا دوسرا مجموعہ۲۔''اردو ماہیے کی تحریک'' کی اشاعت کے بعد کے مطبوعہ مضامین۔اس میں ''غوغائے رقیباں'' والا میٹر نہیں ہوگا۔۳۔ماہیے کے جن مجموعوں کے لئے مجھ سے پیش لفظ یا تاثرات لکھوائے گئے ان کا مجموعہ۔تاہم اس میں صرف وہی میٹر شامل کروں گا جو مطبوعہ کتب میں چھپ چکے ہیں۔لہذا جن احباب نے مجھ سے تاثرات لکھوائے ہیں لیکن ابھی تک اپنے مجموعے نہیں چھپوائے وہ اپنے مجموعے جلد چھپوالیں۔

سوال: آپ نے غزل بھی کہی' نظم بھی۔افسانہ بھی لکھا' انشائیہ اور خاکہ بھی۔تحقیق بھی کی اور تنقید بھی اور ان سب پر مستزاد کہ ماہیے پر تخلیقی' تنقیدی اور تحقیقی تینوں سطح پر کام کیا۔اتنی اصناف میں آپ اپنی شناخت کسے سمجھتے ہیں؟

جواب: میرا خیال ہے کہ میری شناخت اگر کبھی بنے گی تو میرے سارے کام کے تناظر میں بنے گی۔ایک بات واضح کر دوں کہ اگر کوئی کمزور تخلیق کار کئی اصناف میں کام کرے گا تو اس کا ضعف بڑھے گا لیکن اگر کوئی اچھا تخلیق کار کئی اصناف میں اظہار کرے گا تو اس کا ایک کم از کم معیار ہر صنف میں دکھائی دے گا۔میں ریاکاری کی انکساری سے کام نہیں لوں گا۔مجھے اتنا علم ہے کہ اگر آنے والے وقت میں ادب کی کوئی اہمیت اور قدر و قیمت رہی تو میرے کام کے بارے میں' میری ادبی شناخت کے بارے میں آنے والا وقت ہی فیصلہ کرے گا۔وہ وقت جس میں 'میں'۔۔۔۔آپ'۔۔۔۔میرے موجودہ مخالفین۔۔۔۔اور موجودہ دوستوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہوگا۔تب جو بھی فیصلہ ہوگا درست فیصلہ ہوگا! ☆☆☆

(بشکریہ سہ ماہی ''ماہیا رُوپ'' کراچی شمارہ نمبر ا' جنوری تا مارچ ۲۰۰۱ء)

حیدرقریشی سے انٹرویو

جوازجعفری (لاہور)

(یہ انٹرویوایک تحریری سوالنامہ اوراس کے جواب پرمبنی ہے۔جوازجعفری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ''اردوادب یورپ اورامریکہ میں'' کے موضوع پرپی ایچ ڈی کررہے ہیں۔یہ انٹرویواسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔سوالنامہ ای میل سے 12اپریل2003ءکوبھیجا گیاتھا۔13اپریل2003ءکو جواب مکمل کرکے بھیج دیا گیا۔یہ انٹرویوجوازجعفری کی رضامندی کے ساتھ ان کا مقالہ مکمل ہونے سے پہلے شائع کیا جارہاہے۔)

جواز جعفری:آپ کانام؟

حیدر قریشی:قریشی غلام حیدرارشد

جواز جعفری:قلمی نام؟

حیدر قریشی:میراقلمی نام حیدرقریشی ہے

جواز جعفری:فون نمبر؟

حیدر قریشی:0049-6190-930078

جواز جعفری:ای میل؟:

حیدر قریشی:hqg7860000@aol.com

جواز جعفری:مطبوعات؟ پبلشرکانام اورایڈریس؟

حیدر قریشی:مطبوعہ کتب کی تفصیل کچھ یوں ہے:

شاعری:

سلگتے خواب(غزلیں)'عذرااصغر۔تجدیداشاعت گھر۔لاہور،اسلام آباد

عمرِگریزاں(غزلیں'نظمیں'ماہیے)'عذرااصغر۔تجدیداشاعت گھر۔لاہور،اسلام آباد

محبت کے پھول(ماہیے)'سعیدشباب۔نایاب پبلی کیشنز۔خانپور(ضلع رحیم یارخان)

دعائے دل(غزلیں'نظمیں)مشتاق احمد۔نصرت پبلشرز۔لاہور

چاروں مجموعوں کا مجموعہ غزلیں'نظمیں'ماہیے

امین خیال۔گل پبلی کیشنز۔گرجاکھ۔گوجرانوالہ۔(اور۔۔سرورادبی اکادمی۔جرمنی)

تخلیقی نثر:

روشنی کی بشارت(افسانے)'۔۔۔۔۔عذرااصغر۔تجدیداشاعت گھر۔لاہور،اسلام آباد

قصے کہانیاں(افسانے) یہ کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئی لیکن انٹرنیٹ پرمیری سائٹ پرآن لائن موجود ہے

افسانے(دونوں مجموعے''روشنی کی بشارت''اور''قصے کہانیاں''ایک جلد میں)'

شاہدماہلی۔معیارپبلی کیشنز۔دہلی

ایٹمی جنگ(تین افسانے اردواورہندی میں)۔۔۔۔شاہدماہلی۔معیارپبلی کیشنز۔دہلی

میں انتظارکرتاہوں(افسانوں کاہندی ترجمہ)اشوک شرما۔ساہتیہ بھارتی۔دلی

میری محبتیں(خاکے)'(پاکستانی ایڈیشن)سعیدشباب۔نایاب پبلی کیشنز۔خانپور

میری محبتیں(انڈین ایڈیشن)شاہدماہلی۔معیارپبلی کیشنز۔دہلی

سُوئے حجاز(سفرنامہ)'شاہدماہلی۔معیارپبلی کیشنز۔دہلی

فاصلے قربتیں (انشائیے) یہ ابھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے لیکن کتاب انٹرنیٹ پر میری سائٹ پر دستیاب ہے۔

کھٹی میٹھی یادیں (یادنگاری) یہ بھی ابھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئی تاہم یہ بھی انٹرنیٹ پر آن لائن موجود ہے۔

افسانے، خاکے، یادیں، انشائیے (پانچ کتابیں ایک جلد میں۔زیر اشاعت)

تحقیق و تنقید:

ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت (مضامین) سعید شباب۔نایاب پبلی کیشنز۔خانپور

اردو میں ماہیا نگاری (تحقیق وتنقید) عارف فرہاد۔فرہاد پبلی کیشنز۔راولپنڈی

اردو ماہیے کی تحریک (مضامین) عارف فرہاد۔فرہاد پبلی کیشنز۔راولپنڈی

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما (مضامین) شاہد ماہلی۔معیار پبلی کیشنز۔دہلی

ادارت: ادبی رسالہ ''جدید ادب'' خانپور کی ادارت نو سال تک کی۔یہی جریدہ اب جرمنی سے جاری کیا ہے۔دو شمارے شائع کرنے کے بعد عارضی طور پر بند کیا گیا ہے، جلد ہی دوبارہ اشاعت کا آغاز ہو رہا ہے۔

ویب سائٹ: میرے مجموعی ادبی کام پر مشتمل ویب سائٹ www.haiderqureshi.com قائم کی گئی ہے۔یہ میرے تین بہت ہی محبت کرنے والے دوستوں خورشید اقبال، نذر خلیق اور سعید شباب کی محبتوں کا ثمر ہے۔

جواز جعفری: آبائی وطن؟

حیدر قریشی: خانپور، رحیم یار خان میرا آبائی وطن ہے

جواز جعفری: وطن کب چھوڑا؟

حیدر قریشی: ستمبر ۱۹۹۲ء میں

جواز جعفری: آپ نے بخوشی وطن چھوڑا یا جلاوطن کئے گئے؟

حیدر قریشی: جلاوطن تو نہیں کئے گئے لیکن وطن کو بخوشی نہیں چھوڑا۔حالات کا دباؤ اسی طرف لے گیا۔

جواز جعفری: جلاوطنی خود ساختہ تھی یا حکومتی دباؤ تھا؟

حیدر قریشی: یہ ''خودساختہ'' کا لفظ بہت مناسب لگ رہا ہے۔

جواز جعفری: آپ اردو کے جلاوطن اہل قلم میں سے کس کس کو جانتے ہیں؟

حیدر قریشی: جن سے آپ کو متعارف کرایا ہے اور آگے انہوں نے آپ کو جن سے متعارف کرایا ہے، ان سب کو جانتا ہوں۔

جواز جعفری: اس سے پہلے کس ملک میں تھے؟

حیدر قریشی: جرمنی آنے سے پہلے مجھے ایک سال کا عرصہ یونائیٹڈ نیشن کے ادارہ برائے مہاجرین کے تحت انڈیا (دہلی) میں رہنا پڑا تھا۔وہیں سے سیدھا جرمنی بھیجا گیا۔جرمنی آنے کے لئے مجھے ائیر ٹکٹ یونائیٹڈ نیشنز کے مذکورہ ادارہ نے دی تھی اور ویزہ جرمن حکام نے دیا تھا۔فرینکفرٹ ائیر پورٹ پر یونائیٹڈ نیشنز کی ایک نمائندہ نے بون سے آکر مجھے ریسیو کیا تھا۔

جواز جعفری: یہاں آنے سے پہلے آپ کی کون کونسی کتابیں چھپ چکی تھیں اور یہاں آنے کے بعد کیا کیا شائع ہوا؟

حیدر قریشی: یہاں آنے سے پہلے میرا پہلا شعری مجموعہ اور پہلا افسانوی مجموعہ چھپ چکا تھا۔اسی طرح میری مرتب کردہ چار کتب بھی چھپ چکی تھیں۔باقی ساری کتب یہاں آنے کے بعد شائع ہوئی ہیں۔تاہم ان میں سے ''عمر گریزاں'' کی ساری شاعری، ''میری محبتیں'' کے (ایک کو چھوڑ کر) سارے خاکے، ''عہد ساز شخصیت'' کے مضامین، دو کو چھوڑ کر باقی سارے انشائیے اور ''قصے کہانیاں'' کے بارہ میں سے چھ افسانے نہ صرف پاکستان کے زمانے میں لکھے جا چکے تھے

بلکہ مختلف ادبی رسائل میں یہ ساری تحریریں چھپ بھی چکی تھیں۔دو شعری مجموعے، ماہیے پر تحقیق و تنقید کی تینوں کتب، سفرنامہ اور یادیں، یہ خالصتاً جرمنی میں آنے کے بعد ہوئے ہیں۔

جواز جعفری: آپ کے فن اور شخصیت پر ہونے والے کام کی تفصیل؟

حیدر قریشی: ابھی تک جو کام ہو چکا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

ا۔حیدر قریشی فکر و فن تصنیف محمد وسیم انجم۔انجم پبلشرز۔راولپنڈی

۲۔حیدر قریشی فن اور شخصیت مرتبین نذیر فتح پوری، سنجئے گوڑ بولے۔اسباق پبلی کیشنز۔پونہ۔انڈیا

۳۔حیدر قریشی کی ادبی خدمات مرتب پروفیسر نذر خلیق ناشر میاں محمد بخش پبلشرز۔خانپور

۴۔حیدر قریشی کی شخصیت اور فن تصنیف منزہ یاسمین (یہ منزہ یاسمین کا ایم اے اردو کا مقالہ ہے۔اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور کے شعبہ اردو کے چیئر مین پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد اس کے نگران تھے۔ڈاکٹر شفیق احمد کے پیش لفظ کے ساتھ یہ کتابی صورت میں بھی شائع ہو رہا ہے۔)

جواز جعفری: دو مختلف تہذیبوں میں زندگی بسر کرنا کیسا تجربہ ہے؟

حیدر قریشی: دکھ اور آسودگی کی ملی جلی کیفیات ہیں۔ماضی اور وطن کی یادوں کا اپنا جادو ہے اور جرمنی میں رہنے کی اپنی سہولتیں ہیں۔میرے پہلے شعری مجموعہ کی ایک غزل کا سادہ سا مطلع ہے

روگ سمجھا ہے کوئی کب کسی دیوانے کے آدھے ہم تیرے ہیں، آدھے کسی بیگانے کے

یہ شعر اپنی کیفیت کے لحاظ سے اب مجھے جتنا پاکستان اور جرمنی سے اپنے تعلق پر موزوں لگتا ہے اتنا کسی اور کردار پر فٹ نہیں لگتا۔

جواز جعفری: ہجرت نے آپ کی تخلیقی، سماجی اور نفسیاتی زندگی پر کس قسم کے اثرات مرتب کیے؟

حیدر قریشی: آپ کی ترتیب کو الٹ کر جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔نفسیاتی طور پر جہاں مجھے اپنے آپ میں مزید ذہنی کشادگی کا احساس ہوا ہے وہیں ماضی سے تعلق گہرا ہو گیا

ہے۔سماجی طور پر اتنا ہے کہ رزق میں فراخی آ گئی ہے، ویسے یہ فراخی نہیں ہے کہ میں یہاں ایک معمولی سا مزدور ہوں لیکن جب یورو کو پاکستانی روپے سے ضرب دیتا ہوں تو لگتا ہے کہ رزق فراواں ہے۔باقی میں تو انتہائی تنگدستی میں بھی خدا کا شکر گزار تھا اور اب بھی اسی کا شکر گزار ہوں۔تخلیقی طور پر یہ سارے نفسیاتی اور سماجی اثرات کسی نہ کسی رنگ میں ضرور آئے ہوں گے۔ان کو تلاش کرنا تو قاری اور نقاد کے لئے زیادہ آسان ہوگا۔ایک وقفہ کے بعد اب کچھ اندازہ کر پایا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ جرمنی میں آ کر میرا ماہیے کے لئے اتنا کام کرنا شاید اپنی جڑوں سے جُڑنے کا رجحان تھا۔اسی طرح یاد نگاری کے لئے اگرچہ ''میری محبتیں'' نے بنیاد کا کام کیا تھا لیکن اس طرف متحرک ہونے میں ماضی سے وابستگی زیادہ ہونا بھی شامل ہے۔وطن کی محبت میں اس قسم کے شعر تو سطح پر موجود کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں

جرمن احسانات سبھی برحق حیدر۔۔۔۔فیض مگر کچھ اور ہی دھرتی ماں کے تھے

مگر جب اس قسم کے شعر ہوتے ہیں۔۔۔

درختوں پر پرندے لَوٹ آنا چاہتے ہیں۔۔۔خزاں رُت کا گزر جانا ضروری ہو گیا ہے

تو لگتا ہے کہ اندر ہی اندر وطن واپسی کی خواہش مستحکم ہو رہی ہے۔حالانکہ ابھی تک شعوری طور پر ایک کشمکش کے باوجود میں جرمنی ہی میں رہنا چاہ رہا ہوں۔یہ میرا بیان ہے۔تخلیقی سطح پر کون سی کیفیات کیا کہہ رہی ہیں، ان کے بارے میں قارئین اور ناقدین ہی بہتر طور پر دریافت کے عمل سے گزر سکیں گے۔

جواز جعفری: آپ کن کن اصناف میں لکھتے ہیں؟

حیدر قریشی: شاعری میں غزل، نظم، ماہیا۔۔۔نثر میں افسانہ، خاکہ، سفرنامہ، انشائیہ، تحقیق وتنقید سے لے کر یاد نگاری تک تھوڑا بہت لکھنے کی توفیق ملی ہے۔گزشتہ برس سے جو عالمی حالات میں تبدیلیاں آ رہی ہیں، ان کے پیش نظر میں نے ''منظر اور پس منظر'' کے نام سے کالم لکھنا شروع

کیا ہے۔صحافت سے میرا تعلق قاری کی حد تک ہے۔لیکن اس عرصہ میں جو کچھ دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا جس حد تک کہنے کی گنجائش تھی میں نے اپنی بات کہہ دی ہے۔

جواز جعفری: آپ نے اپنے نظامِ فکر میں کن مسائل اور سوالات کو زیادہ اہمیت دی ہے؟

حیدر قریشی: اپنی تخلیقات میں شعوری طور پر کسی نظام فکر یا مسائل کو بیان کرنا کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا۔میں تخلیقی لمحات میں پوری توجہ اپنے اندر پر مرکوز رکھتا ہوں۔وہاں سے جو کچھ مل جائے پیش کر دیتا ہوں۔شعوری طور پر میں مذہبی انتہا پسندی کے برعکس تصوف سے زیادہ رغبت رکھتا ہوں۔میری ذاتی زندگی کے سارے نشیب وفراز لاشعوری طور پر میرے شعور کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔لہٰذا میری عملی زندگی میں پیش آنے والے مسائل اور سوالات ہی میرے کسی نظام فکر کی تشکیل کا باعث بنے ہوں گے اور لاشعوری طور پر سہی کسی نہ کسی رنگ میں میری تخلیقات میں در آئے ہوں گے۔لیکن وہ کیا ہیں؟اس کا پتہ تو میری تخلیقات سے لگانا چاہئے۔

جواز جعفری: مغرب میں تخلیق پانے والے اردو ادب کے بڑے موضوعات کیا ہیں؟

حیدر قریشی: مغرب میں تخلیق ہونے والا اردو ادب ہمارے ادب کے مرکزی دھارے ہی کے تابع ہے۔یہاں بعض لوگوں نے جنسی چکا چوند یا پھر فیشن زدہ دہریت کو اپنا موضوع بنانے کی کوشش کی تھی۔جبکہ ان حوالوں سے اردو میں پہلے ہی سے زیادہ اہم کام ہو چکا ہے۔تارکین وطن کو درپیش معاشرتی مسائل پر زیادہ تر اچھا لکھا گیا ہے تاہم ہجرت کے مسئلہ کی سطح پر کوئی بڑی چیز سامنے نہیں آئی۔جیسے انتظار حسین کے ہاں ایک سطح ہے۔یا جیسے قیام پاکستان کے نتیجہ میں دونوں طرف ہجرت کی اچھی کہانیوں کی جو سطح ہے وہ یہاں خال خال ہی ملتی ہے۔مغرب میں آنے کے نتیجہ میں ہم لوگ جدید علوم اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے کچھ نیا پیش کر سکتے تھے۔اس معاملہ میں کوئی اہم تخلیق کم از کم میری نظر سے نہیں گزری۔ایک افسانہ نگار نے کمپیوٹر کے حوالے سے بہت عمدہ کہانی لکھی لیکن بعد میں پتہ چلا وہ سرقہ تھا۔چوری پکڑی گئی۔خود میں نے ایٹمی جنگ کے بعد

کی فضا کو موضوع بنا کر جو تین افسانے لکھے ہیں وہ میرے پاکستانی دور کی عطا ہیں جبکہ مغرب میں آ کر تو میں اور بھی زیادہ دیسی ہو گیا ہوں۔بہر حال میری نظر میں اردو ادب کے مرکزی دھارے سے ہٹ کر مغرب میں کوئی اہم اور قابلِ ذکر پیش رفت نہیں ہے۔

جواز جعفری: یورپ اور امریکہ میں تخلیق پانے والا اردو ادب برِصغیر کے ادب سے کس حد تک مختلف ہے؟

حیدر قریشی: کسی حد تک بھی نہیں۔یہاں کی عمومی صورتحال تو یہ ہے کہ لکھنے والوں کا زیادہ زور شاعری پر ہے۔اس میں بھی دولت کے بل پر پاکستان اور انڈیا سے شعری مجموعے لکھوانے اور چھپوانے والے شعراء کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔پچاس سال کی عمر کے بعد یکا یک کوئی شاعر نمودار ہوتا ہے اور دو برسوں میں چار شعری مجموعے چھپوا کر علامہ اقبال بن جاتا ہے۔یہاں کے بڑے مشاعروں میں بے وزن شعراء دھڑلے سے نہ صرف بے وزن کلام سناتے ہیں بلکہ داد بھی پاتے ہیں۔جو گنتی کے چند شاعر اور ادیب اچھا لکھ رہے ہیں وہ مغرب کے حوالے سے کوئی الگ تشخص نہیں رکھتے۔ان کی ساری پہچان اردو ادب کے مرکزی دھارے میں ہی بنتی ہے۔

جواز جعفری: کیا اس ملک کے کسی کالج یا یونیورسٹی میں اردو زبان پڑھائی جاتی ہے؟

حیدر قریشی: یہاں جرمنی میں ہائیڈل برگ اور برلن کا تو میرے علم میں ہے کہ وہاں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ممکن ہے بعض اور شہروں میں بھی پڑھائی جاتی ہو۔

جواز جعفری: کیا ان اردو ڈیپارٹمنٹس میں کوئی تحقیقی وتنقیدی کام ہوا ہے؟

حیدر قریشی: میرا خیال ہے کہ یہاں اردو کے بارے میں جو تحقیقی کام ہوا ہے وہ زیادہ تر جرمن زبان میں ہوا ہے۔ویسے بھی یہاں جو اردو پڑھائی جاتی ہے وہ زیادہ تر ایسے لوگوں کے لئے ہوتی ہے جو اردو بولنے والے ممالک میں کسی سفارتی ذمہ داری کے لئے جانا چاہتے ہوں یا بزنس کے لئے جانا چاہتے ہوں۔

جواز جعفری: ان ڈیپارٹمنٹس کے سربراہوں کے نام اور ای میل ایڈریس مل سکتے ہیں؟

حیدر قریشی: میرے پاس تو کسی ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ کا نام اور ای میل ایڈریس نہیں ہے۔ پتہ کرتا ہوں اگر مل گیا تو بھیج دوں گا۔

جواز جعفری: اس ملک میں اردو بولنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

حیدر قریشی: میرا خیال ہے کہ جرمنی میں پچاس ہزار کے لگ بھگ اردو جاننے والے پاکستانی موجود ہیں۔ اگر انڈیا کے ہندی بولنے والوں کو بھی اس میں شامل کرلیں تو اس میں مزید اضافہ تصور کیا جاسکتا ہے۔

جواز جعفری: اردو بولنے والے والدین کی اولاد کا اردو زبان کے حوالے سے رویہ کیسا ہے؟

حیدر قریشی: جو بچے یہاں پل بڑھ رہے ہیں انہیں تو آپ اردو سے نابلد ہی سمجھیں۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہوگا کہ وہ گھر پر ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیں گے۔ اور بس!

جواز جعفری: آپ کے نزدیک یورپ اور امریکہ میں اردو زبان کا مستقبل کیا ہے؟

حیدر قریشی: اپنی مخصوص پاکٹ کی حد تک بہت محدود مستقبل ہے۔ صورتحال زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔

جواز جعفری: تارکین وطن کے ساتھ لوکل آبادی کا سلوک کیسا ہے؟

حیدر قریشی: ملا جلا رویہ ہوتا ہے۔ بہت اچھے لوگ بھی ملتے ہیں اور بعض تعصب رکھنے والے بھی ہوتے ہیں۔ میرا واسطہ عمومی طور پر جن لوگوں سے رہا ہے وہ سب اچھے ہی نکلے ہیں۔

جواز جعفری: بطور ادیب آپ کو اظہار کے سلسلے میں کس قسم کے مسائل کا سامنا ہے؟

حیدر قریشی: میرا خیال ہے کہ بات کہنے کا سلیقہ آتا ہو تو پاکستان میں رہ کر بھی دل کی بات سلیقے سے کہی جاسکتی ہے۔ بے شک ہمارے معاشرے کے مقابلہ میں یہاں اظہار کی آزادی زیادہ ہے لیکن اس آزادی کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم لکھنے میں شتر بے مہار ہو جائیں۔ مجھے

پاکستان میں بھی اپنے تخلیقی اظہار میں کوئی سنگین مسئلہ نہیں تھا اور یہاں بھی ماحول ٹھیک ہے۔ سخت ترین بات کو نرم لہجے میں اور مشکل بات کو آسانی کے ساتھ کہنا ہی تو لکھنے کا فن ہے۔ یہ فن آتا ہو تو اظہار کے سلسلے میں بہ استثنائے چند کہیں بھی کوئی مسئلہ پیش نہیں آسکتا۔

جواز جعفری: کیا آپ روزگار کے سلسلے میں یہاں مقیم ہیں یا پھر مستقل قیام کا ارادہ ہے؟

حیدر قریشی: اب تو جرمنی کو اپنا دوسرا وطن سمجھ لیا ہے۔ ویسے کبھی کبھار میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی ضرورت کی رقم جمع کروں اور پاکستان آجاؤں۔ وہاں وہ رقم بنک میں جمع کرا کے ریٹائرڈ لائف انجوائے کروں۔ لیکن میری بیوی کہتی ہے کہ میں تین ماہ سے زیادہ پاکستان میں نہیں رہ سکوں گا، جرمنی واپس آجاؤں گا۔ بہر حال اندر کی یہ کشمکش تو بہر حال ہے۔

جواز جعفری: کیا آپ کسی نئی ہجرت کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟

حیدر قریشی: یورپ میں جرمنی سے بڑھ کر صاف اور خوبصورت ملک کوئی اور ہے ہی نہیں۔۔۔۔ انگلینڈ، ہالینڈ، فرانس اور بیلجئم کے مقابلہ میں جرمنی بہت اچھا ملک ہے۔ میں یہاں رہتے ہوئے یہاں سے کہیں اور جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر یہاں سے جانا ہے تو پھر صرف اپنے وطن واپس جانا ہے۔ ورنہ یہی اپنا دوسرا وطن ہے۔ اور اب حال ہی میں عراق کے خلاف امریکی جارحیت کے مقابلہ میں جرمنی نے جو سفارتی کردار ادا کیا ہے اس وجہ سے یہ ملک مجھے اور بھی اچھا اور اپنا لگنے لگا ہے۔

جواز جعفری: اس ملک میں اردو بولنے والی آبادی کو کس قسم کے مسائل کا سامنا ہے؟

حیدر قریشی: ہم سب لوگ دو حصوں میں تقسیم اور ایک ہی وقت میں دو زندگیاں بسر کرنے والے لوگ ہیں۔ یہی ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

جواز جعفری: آپ کی وطن واپسی کا امکان کس حد تک ہے؟

حیدر قریشی: ففٹی ففٹی

جواز جعفری: میرے تحقیقی کام کے سلسلے میں آپ کس کس اہل قلم کو مُنتخب کرنا پسند کریں گے؟

حیدر قریشی: ان لوگوں کے ادبی کام کے بغیر آپ کا تحقیقی کام مکمل نہیں ہوگا۔شان الحق حقی، گیان چند جین، ہرچرن چاولہ، جتیندر بلو، ساقی فاروقی، محمود ہاشمی، سعید انجم، ستیہ پال آنند،۔۔یہ تو ادب کے مرکزی دھارے کے اہم ادیب ہیں۔ان کے علاوہ بھی بہت سے اچھے لکھنے والے ہیں۔اب آپ خود بھی تو کچھ محنت کیجئے نا!

جواز جعفری: یہاں اردو زبان وادب کی ترویج کے لئے کون کونسی ادبی تنظیمیں کام کر رہی ہیں ان کے عہدیداران کے نام؟

حیدر قریشی: جرمنی میں سب سے فعال ادبی انجمن چلانے والے صاحب اس وقت جرمن جیل میں ہیں۔باقی کے انجمنیں چلانے والے بھی زیادہ تر غیر تخلیقی لوگ ہیں۔میں ان کے بارے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔

جواز جعفری: اس ملک کے ریڈیو اور ٹی وی پر اردو زبان کو روزانہ کتنا وقت دیا جا رہا ہے ان پروگراموں میں ادب کی شرح فی صد کیا ہے؟

حیدر قریشی: یہاں بڑے پیمانے پر ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ایک مقامی ٹی وی چینل ''اوفنر کنال'' نے پاکستانیوں کو آفر کی تھی۔اس کے نتیجہ میں ایک تو منہاج القرآن والے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔وہ یہاں کے مختلف پروگرام ریکارڈ کر کے دکھاتے رہتے ہیں۔جماعت احمدیہ بھی اس سے پورا فائدہ اٹھا رہی ہے۔تاہم یہ ایک طرح سے فرینکفرٹ کی بلدیاتی حدود کا چینل ہے۔اور کوئی ایسا سلسلہ اگر ہے بھی تو میرے علم میں نہیں ہے۔

جواز جعفری: یہاں سے اردو کا کوئی اخبار یا جریدہ شائع ہوتا ہے کیا آپ اس کے ایڈریس بھجوا سکتے ہیں؟

حیدر قریشی: ڈیلی اوصاف کچھ عرصہ پہلے یہاں سے نکلنا شروع ہوا ہے۔میرے دوست

ارشاد ہاشمی اس کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر ہیں۔

جواز جعفری: میرے موضوع (اردو ادب یورپ اور امریکہ میں) کے حوالے سے آپ کسی کتاب کے بارے میں جانتے ہیں اس کے مصنف اور پبلشر کا نام بتا کر شکر گزار فرمائیں؟

حیدر قریشی: سلطانہ مہر نے امریکہ سے ''سخنور'' تین جلدوں میں شاعروں کا اور ''گفتنی'' ایک جلد میں، نثر نگاروں کا تذکرہ شائع کیا تھا۔عاشور کاظمی کی کتاب ''بیسویں صدی کے اردو اخبارات ورسائل مغربی دنیا میں'' ان کے اپنے ادارہ ''انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ کلچر۔برطانیہ'' نے شائع کی ہے۔یہ کتابیں آپکے کچھ کام آ سکتی ہیں۔

جواز جعفری: اردو زبان وادب کی ترقی کے حوالے سے مقامی حکومت کا رویہ کیسا ہے؟

حیدر قریشی: جرمن حکومت کو موثر طریقے سے توجہ دلائی جائے تو وہ بہت کچھ کرنے کو تیار ہو جائیں گے لیکن ابھی تک کسی موثر ادارہ نے، کسی فعال جماعت نے یا پاکستانی سفارتخانہ نے اس سلسلہ میں سوچا تک نہیں ہے۔اب جرمن حکام از خود تو آپ کی زبان کی ترویج کے لئے پیش کش کرنے سے رہے۔

جواز جعفری: یورپ اور امریکہ میں مقیم اردو زبان کے اہل قلم کی تخلیقات پر اس ملک کی قومی زبان کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟

حیدر قریشی: گہرا مطالعہ کرنے کے بعد کوئی گہری نظر رکھنے والا نقاد ہی ایسے اثرات کی نشاندہی کر سکتا ہے۔یہ تو بجائے خود ایک پراجیکٹ بن سکتا ہے۔

جواز جعفری: یہاں کی کسی لائبریری میں اردو زبان وادب سے متعلق کتابیں موجود ہیں؟

حیدر قریشی: ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں تو میں نے اردو لائبریری دیکھی تھی۔میرا خیال ہے جہاں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے وہاں چھوٹی سی سہی لیکن اردو کی لائبریری ضرور ہوتی ہے۔

جواز جعفری: اس ملک میں اردو زبان وادب کا پس منظر کیا ہے اردو زبان یہاں کیسے پہنچی؟

حیدر قریشی: یار! میں نرا پُرا تخلیقی آدمی ہوں،تھوڑا بہت تحقیقی کام کیا بھی ہے تو ماہیے کے بارے میں۔۔۔جرمنی میں اردو کے پس منظر وغیرہ کے بارے میں کچھ بیان کرنے کے لئے منیرالدین احمد زیادہ موزوں آدمی ہیں۔ان سے ضرور رجوع کریں۔

جواز جعفری: آپ اپنے بارے میں مزید کچھ بتانا پسند فرمائیں گے؟

حیدر قریشی: ایک درخواست کروں گا کہ مجھے یورپ اور امریکہ میں مقیم شاعر اور ادیب شمار کرنے کے بجائے اردو ادب کا شاعر اور ادیب سمجھیں۔پھر بے شک مجھے ادب کی آخری صف میں بٹھا دیں، بے شک صفوں سے پرے جوتوں میں بٹھا دیں۔یورپ اور امریکہ میں اتنے جعلی شاعر اور ادیب پیدا ہو گئے ہیں کہ اس حوالے سے اپنی پہچان سن کر یا پڑھ کر اب شرمندگی ہونے لگتی ہے۔میں جرمنی آنے سے پہلے کا شاعر اور ادیب ہوں۔یہاں آکر شاعر اور ادیب نہیں بنا۔

☆☆☆

(یہ انٹرویو مئی ۲۰۰۳ء کو اردوستان ڈاٹ کام اور القمر آن لائن ڈاٹ کام پر شائع کر دیا گیا تھا۔ اور سہ ماہی ’’اسباق‘‘ پونہ شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ء میں بھی اسے شائع کیا گیا ہے۔)

حیدر قریشی سے مکالمہ

فنکار اب بھی مستور ہے

افتخار امام صدیقی

مدیر ماہنامہ شاعر بمبئی

۱۔کیا آپ اپنے لئے لکھتے ہیں؟

☆جی ہاں

۲۔کیا آپ دوسروں کے لئے لکھتے ہیں؟

☆ قارئین کے لئے بھی

۳۔کیا آپ کے ذہن میں نئی نسل کی تربیت بھی رہتی ہے؟

☆میں صرف اپنے اندر سے آنے والی آواز پر توجہ دیتا ہوں

۴۔کیا آپ آزادانہ سوچ کو پسند کرتے اور لکھتے ہیں؟

☆ جیسے میں نے ابھی ذکر کیا ہے،لمحۂ تخلیق میں اندر کی آواز کی آزادی کا قائل ہوں۔

۵۔کیا آپ اپنے فن پارے کی پہلی لکھی شکل سے مطمئن ہو جاتے ہیں؟

☆تھوڑی بہت نظر ثانی کرتا ہوں۔

۶۔کیافن پارے کوکوئی آخری شکل دینے کے مراحل سے آپ گزرتے ہیں؟

☆جی ہاں

۷۔وہ مراحل کیا ہیں؟

☆اپنے لکھے پرنظرثانی کرنا،نوک پلک سنوارنا۔

۸۔اب تک آپ نے جوکچھ تخلیق کردیاہے،کیااس سے مطمئن ہیں؟

☆اس حدتک اطمینان ضرور ہے کہ جوکچھ میرے پلے تھاپیش کردیاہے۔باقی مکمل اطمینان تو ہونا بھی نہیں چاہئے۔

۹۔کیا آپ نے کوئی بڑاادبی کارنامہ انجام دیاہے؟

☆ویسے تو کوئی کارنامہ انجام نہیں دیالیکن جس طرح جعلی شاعروں اور چور ادیبوں نے مل کر میرے خلاف شرمناک مہم چلائی تھی اس سے مجھے کبھی کبھی گمان گزرتا ہے کہ شاید مجھ سے کوئی ایک آدھا اچھاادبی کام سرزد ہوگیاہے۔

۱۰۔کیا آپ اپنی سابقہ تخلیقات پرنظرثانی کرتے رہتے ہیں؟

☆اپنے لکھے کو پڑھتے ہوئے کبھی کبھی ایسا کرلیتاہوں۔

۱۱۔کیا آپ لکھنے سے قبل بہت غوروخوض کرتے ہیں؟

☆تخلیقی عمل میں تو طویل عرصہ کی سوچ کاعمل دخل غیرارادی طورپرشامل ہوتاہے۔تحقیق وتنقید کے سلسلہ میں غوروخوض اور ہوم ورک کرنا پڑتا ہے۔

۱۲۔کیاتخلیقی عمل کے لئے مطالعہ ضروری ہے؟

☆تخلیق کارتو تلمیذالرحمٰن ہوتاہے۔البتہ مطالعہ اسے مزید چمکا دیتاہے۔

۱۳۔کیا آپ اپنے تجربوں اورمشاہدوں کواپنےفن پاروں میں سموتے ہیں؟

☆میرے ہاں تو تجربےاورمشاہدے ہی باطن میں رچ کرفن پارے بنتے ہیں۔

۱۴۔کیااب بھی آپ کے ذہن میں کوئی ایساخیال ہے جسے آپ نے تخلیق نہیں کیا ہے؟

☆کئی بارایسا ہوا کہ کسی شعری یاافسانوی احساس نے روپ دھارنا چاہااور میں نے کسی مصروفیت کے باعث اسے موخرکردیا۔بعد میں وہ خیال ہی ذہن سے محوہوگیا۔

۱۵۔وہ خیال کیا ہے؟

☆کوئی ایساخیال یادرہ جاتا تواسے تخلیق کاروپ دے دیتا۔

۱۶۔کیا آپ تنقید پسند کرتے ہیں؟

☆تنقید پسند کرتا ہوں اورگالیاں برداشت کرتا ہوں۔

۱۷۔کیا آپ قارئین ونقادحضرات سے مایوس ہوتے ہیں؟

☆کبھی نہیں۔اگرکوئی دانستہ مجھےنظرانداز کریں تو میں ان کی مجبوری کااحساس کرلیتاہوں۔

۱۸۔کیا آپ نے لغت سے دوستی کی ہے؟

☆کسی ضرورت کے تحت استفادہ کرلیتاہوں۔

۱۹۔کیا آپ ملکی اورغیرملکی زبانوں کاادب بھی پڑھتے ہیں؟

☆تھوڑابہت،وہ بھی ترجمہ کی حدتک

۲۰۔کیا آپ اپنے سے بڑی ادبی شخصیت سے مرعوب ہوجاتے ہیں؟

☆میں بڑے اوراچھے ادیبوں سے محبت کرتا ہوں۔

۲۱۔کوئی قابلِ ذکرادبی شخصیت،کتاب،رسالہ؟

☆شخصیت ڈاکٹروزیرآغا،کتابیں بھی انہیں کی ''اک کتھاانوکھی''اور''شام کی منڈیر سے''

۲۲۔کوئی قابلِ ذکرادبی رسالہ؟

☆میرے ذاتی تجربات کے حوالے سے اوراق،شاعر،استعارہ،ادبِ لطیف،اسباق،گلبن،ان کے لئے علاوہ بھی بہت اچھے رسالے ہیں۔

۲۳۔کیا نثر لکھنا شاعری سے زیادہ مشکل کام ہے؟

☆میرے لئے تو دونوں ایک جیسے ہیں۔

۲۴۔کیا آپ کسی مستعار ادبی تھیوری کو اہم جانتے ہیں؟

☆ادبی نظریات کا ایک زبان سے دوسری زبانوں میں عمل دخل تو ہوتا رہتا ہے۔لیکن اگر آپ کا اشارہ مابعد جدیدیت سے ہے تو میں اس معاملہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے موقف کو مانتا ہوں۔انہوں نے نوے کے شروع میں اسے یہودی سازش قرار دیا تھا اور اس تھیوری کی Deconstruction کے عملی مظاہرے افغانستان سے عراق تک اب ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔

۲۵۔کیا اپنے کلاسیکی ادب کا مطالعہ ضروری ہے؟

☆بہت ضروری۔

۲۶۔کیا میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، پریم چند، فیضؔ اور فراقؔ کے علاوہ بھی قابلِ ذکر نام ہیں؟

☆بہت سارے نام ہیں۔

۲۷۔وہ کون سے ہیں؟

☆مومن خان مومن، سیماب اکبرآبادی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، منٹو، ممتاز مفتی، مجید امجد، میراجی، راشد، اور بھی بہت سارے نام۔۔۔۔

۲۸۔اب تک جو ادبی تاریخیں لکھی گئی ہیں، کیا وہ ہماری ادبی تاریخ کی مکمل نمائندگی کرتی ہیں؟

☆چھوٹی موٹی ترجیحات تو ہر مورخ کی ہوتی ہیں تاہم ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ بڑی حد تک مناسب ہے۔گو اس عہد پر ان کا کام بہت کم ہے۔

۲۹۔کیا ہندوستان میں اردو کا مستقبل روشن ہے؟

☆جب تک اردو والے خود ہی اپنی شمعیں جلائے رکھیں گے تب تک کچھ نہ کچھ روشنی رہے گی۔

۳۰۔کیا کسی عالمی ادبی چینل کی ضرورت ہے؟

☆یقیناً ضرورت ہے، لیکن اردو والوں کی نفسانفسی شاید اسے کامیاب نہ ہونے دے۔

۳۱۔کیا اردو ادب ملکی و غیر ملکی زبانوں کے ادب کے ساتھ فخر کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے؟

☆یقیناً رکھا جا سکتا ہے۔

۳۲۔وہ فن پارے کیا ہیں؟

☆آپ مجھے اِس عہد کے مغربی فن پارے بتائیں میں ان کے معیار کے اردو فن پارے بتادوں گا۔

۳۳۔کیا آپ کے بچے اردو پڑھتے ہیں؟

☆میرے سارے بچے روانی کے ساتھ اردو پڑھنا، بولنا اور لکھنا جانتے ہیں۔

۳۴۔کیا انگریزی کی تعلیم ضروری ہے؟

☆نہ چاہتے ہوئے بھی شاید یہ زبان سب کی مجبوری بنتی جا رہی ہے۔

۳۵۔کیا الیکٹرونک میڈیا، پرنٹ میڈیا پر حاوی ہو گیا ہے؟

☆اگرچہ پرنٹ میڈیا کی اہمیت ختم نہیں ہوگی لیکن الیکٹرونک میڈیا حاوی ہو گیا ہے۔اور اس کی وجہ سے عوام کا ذوق پست ہو رہا ہے۔

۳۶۔کیا آپ عشق پر یقین رکھتے ہیں؟

☆کامل یقین

۳۷۔کیا ایک فنکار کو ایوارڈز وغیرہ کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے؟

☆ہرگز نہیں اور یہ بھی یقین رکھیں کہ کوئی اہم ایوارڈ لابنگ کئے بغیر نہیں ملے گا۔

۳۸۔کیا اردو کے اساتذہ اپنی زبان کا ادب پڑھتے ہیں؟

☆اردو کے اساتذہ اور اردو کے ادیبوں کی ایک بڑی تعداد سطحی مطالعہ سے آگے نہیں جا رہی۔

۳۹۔کیا آپ کوئی ادبی رسالہ شائع کرنا چاہتے ہیں؟

☆ایسا چاہتا تھا اور اپنا جدید ادب پھر سے جاری کر چکا ہوں۔

۴۰۔کیا ادب اور مذہب میں کوئی رشتہ ہونا چاہئے؟

☆دونوں میں کسی رشتہ کی بات تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن دونوں ہی ’’نامعلوم‘‘ اور ’’ان دیکھے‘‘ کی جستجو کے سفر سے عبارت ہیں۔

۴۱۔کیا ادب، مذہب، سیاست کا رُخ موڑ سکتا ہے؟

☆ادب اثر انداز ہوسکتا ہے لیکن ادب کا عمل آہستہ رو ہوتا ہے۔سو اس کا کوئی بھی اثر غیر محسوس طریقے سے ہوتا ہے۔

۴۲۔اپنی پسندیدہ خوشبو کا نام بتایئے؟

☆چمبیلی، گلاب، صندل، رات کی رانی اور بہت سی دوسری۔

۴۳۔کس طرح کی موسیقی آپ سننا پسند کرتے ہیں؟

☆سہگل کے دور سے لے کر ۱۹۷۵ء کے زمانے تک کی موسیقی۔

۴۴۔غزل گائیکی کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟

☆زمانے کی برق رفتاری اور پاپ میوزک۔لیکن میں آج بھی سہگل کی گائی ہوئی غزل ’’بقدرِ شوق اقرارِ وفا کیا‘‘ سے لے کر مہدی حسن اور جگجیت تک سب کو شوق سے سنتا ہوں۔

۴۵۔آپ کا پسندیدہ رنگ کونسا ہے؟

☆ہلکا سبز، کریم کلر اور پیازی رنگ۔

۴۶۔کیا آپ خدا پر یقین رکھتے ہیں؟

☆بہت گہرا یقین اور اس یقین کے کئی ذاتی تجربے بھی۔

۴۷۔کوئی قابلِ ذکر ادبی واقعہ جو آپ کے ساتھ گزرا؟

☆جب میری پہلی غزل چھپی۔جب مجھ پر پہلی کتاب چھپی۔جب مجھ پر یونیورسٹی میں تحقیقی کام ہوا۔اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں۔

۴۸۔کیا تخلیقی نثر گائی جاسکتی ہے؟

☆جس قسم کی موسیقی آجکل چل رہی ہے اس میں تو غیر تخلیقی نثر بھی گائی جا رہی ہے۔

۴۹۔نئی نسل کے وہ قلم کار جن میں مستقبل کے امکانات ہیں؟

☆مجھے ناصر عباس نیر کی تنقیدی صلاحیتوں میں بڑے امکان دکھائی دیتے ہیں۔اگرچہ ہمارے بنیادی رجحانات ایک دوسرے سے شدید ٹکراؤ رکھتے ہیں۔باقی یقیناً کئی نئے لکھنے والے آنے والے کل کے اچھے تخلیق کار ثابت ہوں گے۔

۵۰۔نئی نسل کے لئے کوئی اہم پیغام؟

☆مجھ سمیت کسی کے پیغام پر کان مت دھرو صرف اپنے اندر کی آواز سنو اور اس کے مطابق چلو۔

۵۱۔کیا اردو کی نئی بستیوں کا ادب ذکر کے قابل نہیں؟

☆ادب کے مرکزی دھارے سے کٹ کر کسی کا کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہے۔نئی بستیوں کے حوالے سے جانے جانا ’’کوٹہ سسٹم‘‘ کے تحت ادیب بننا ہے۔

۵۲۔کیا یورو، ڈالر کے بل پر نام نہاد قلم کار خود کو منوا رہے ہیں؟

☆ان بیچاروں کو کیا مانا جانا ہے۔لیکن بہر حال یہ بدبختی کی بات ہے کہ غیر جینوئن اور جعلی لوگوں پر کتابیں لکھوانے اور چھپوانے کا کاروبار چل نکلا ہے۔ہندو پاک میں جو لوگ جان بوجھ کر ایسے لوگوں کو پروجیکٹ کر رہے ہیں وہ درحقیقت ادب کے نام پر ’’دھندہ‘‘ کر رہے ہیں۔

۵۳۔کیا اردو کی ان بستیوں میں جعلساز، نام نہاد قلم کاروں کا زور بڑھ رہا ہے؟

☆یقیناً ایسا ہو رہا ہے۔پہلے غیر جینوئن شاعر اپنی بے وزن کتابیں فخر سے چھپوا لیتے تھے۔میں نے ان کے خلاف مہم چلائی تو ان کے حامیوں کا ایک جعلی ٹولہ ابھر کر سامنے آ گیا۔یہ لوگ بے وزن

شاعر بھی نہیں ہیں۔صرف نقد ادائیگی کر کے پورے شعری مجموعے مطبوعہ صورت میں حاصل کر لیتے ہیں۔ایسے جعلی شاعر جرمنی سے لے کر امریکہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔آپ ان سب کو بے نقاب کریں میں خود ایک ایک کی نشاندہی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ان کے اوریجنل یا جعلی ہونے کو جانچنا بھی کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔۔۔۔

۵۴۔کیا جرمنی سے ادبی رسالہ شائع کرنا کوئی نیا تجربہ ہے؟

☆جدید ادب تو خانپور کے زمانہ سے نکالتا رہا ہوں۔چند سال پہلے بھی جرمنی سے شروع کیا تھا۔اس لئے نئے تجربے والی بات کوئی نہیں ہے۔ہاں اس لحاظ سے نئی بات ضرور ہے کہ اس بار جدید ادب کتابی صورت کے ساتھ انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہوتا ہے۔

۵۵۔کیا ہندوستان اور پاکستان کا اردو ادب ایک دوسرے سے مختلف اور منفرد ہے؟

☆بعض مقامی عوامل کسی انفرادیت کا باعث ہو سکتے ہیں لیکن عمومی طور پر دونوں ملکوں کا اردو ادب بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔

۵۶۔کیا کوئی اردو، جرمن لغت تیار ہوئی ہے؟

☆مجھے یاد پڑتا ہے کہ مقتدرہ اسلام آباد نے ایک اردو جرمن لغت شائع کی تھی۔خورشید علی اور امجد اور کچھ اور لوگوں نے بھی انفرادی طور پر یہ کام کیا ہے۔

۵۷۔کیا جرمن زبان کے ادباء وشعراء ہندوپاک کے اردو قلم کاروں کو جانتے ہیں؟

☆بہت کم۔۔۔نہ ہونے کے برابر

۵۸۔کیا ہمارے نقادوں نے آزاد نظم کے فروغ میں،غزل کے ساتھ انصاف کیا ہے؟

☆کسی نقاد کے فیصلے کا انتظار کئے بغیر غزل اپنی قوت کے بل پر سربلند ہے۔نظم کا فروغ بری بات نہیں لیکن جن لوگوں نے نظم کے فروغ کے لئے غزل کو لپیٹنا چاہا وہ بیچارے تو خود اپنی نظموں سمیت لپیٹے گئے۔

۵۹۔کیا غزل کو مغربی ممالک میں متعارف کروایا گیا ہے؟

☆غزل مغرب والوں کو مشکل سے سمجھ میں آئیگی۔مغرب والے سائنسی طور پر پورے کُل کو کھول کر جانچتے ہیں جبکہ غزل قطرے میں سمندر دکھانے کا عارفانہ تجربہ ہے۔یہ مزاج کا بنیادی فرق ہے۔ہمیں اپنے مزاج اور اپنی روایت کے مطابق ہی آگے بڑھنا ہے۔

۶۰۔کیا اردو ادب جرمن زبان میں ترجمہ ہوتا ہے؟

☆تھوڑا بہت کام ہوتا رہتا ہے۔

۶۱۔کچھ ایسے جرمن مترجموں کے نام بتایئے جو اردو بھی جانتے ہیں؟

☆یہاں اکیڈمک سطح پر بہت سے لوگ ہیں۔جن کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں ان میں ڈاکٹر کرسٹینا ہیں۔سانڈرا جوسٹ ہیں۔اولرک سٹارک ہیں۔اردو جاننے والی سوئس بی بی ارسلا روٹن ہیں۔

۶۲۔جرمن زبان میں شائع ہونے والی ایسی کتابوں کے نام بتایئے جو خالص اردو ادب پر مشتمل ہوں؟

☆کرسٹینا اور سانڈرا کے ترجموں کی ایک مشترکہ کتاب URDU Literature میں نے دیکھی تھی۔اس قسم کا کام یہاں کسی حد تک ہوتا رہتا ہے۔چند اہم تراجم کی تفصیل یہ ہے:

1-Ursula Rothen-Dubs (ed. and transl.), Allahs indischer Garten. Ein Lesebuch der Urdu-Literatur. Frauenfeld 1989

2-Christina Oesterheld, (ed. and transl.), Gesteht's!die Dichter des Orients sind größer. Urdu Literatur. Berlin1991.

3-Saadat Hasan Manto, Blinder Wahn (5 stories). Berln 1997.

4-Mirza Muhammad Hadi Ruswa, Die Kurtisane von Lakhnau. (Umra'o Jan Ada, transl. and with an introduction by Ursula Rothen-Dubs). Zürich 1971.

اقبال اور غالب کے تراجم کے کام اپنے اپنے طور پر Annemarie Schimmel اور Christoph Bürgel. نے کئے ہیں۔این میری شمل کی کتاب کا نام ہے:

Ghalib, Woge der Rose, Woge des Weins.
(ghazals, transl. by Annemarie Schimmel)

ان لوگوں نے بھی کچھ تراجم کئے ہیں

Erika and M.H. Zaidi
Martin Pfeiffer
Lothar Lutze
Helmut Nespital

۶۳۔جرمن زبان کے چند ایک ادبی رسائل کے نام کیا ہیں؟

☆☆

Literature
Kursbuch
Neue deutsche Literatur

Weimarer Beiträge

☆☆☆

(ماہنامہ شاعر ممبئی کے شمارہ نومبر ۲۰۰۴ء کے لئے ۱۶؍اپریل ۲۰۰۴ء کو مکمل کیا گیا)

انٹرنیٹ کے ذریعے مکالمہ

(حیدر قریشی کی تخلیقات اور تحریروں کی روشنی میں)

نذر خلیق (خانپور)

نذر خلیق: میں کوشش کروں گا کہ انٹرویو کے روایتی سوالوں سے بچ کر ایسے سوال کر سکوں جن سے آپ کے فن کی مختلف جہتوں کو سمجھنے میں آپ کے جوابوں سے کچھ مدد مل سکے۔تو میں آپ کی شاعری سے بات شروع کرتا ہوں۔کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے شاعری کے حوالے سے تمام امکانات کو پا لیا ہے اور آپ کی شاعری کے بارے میں جو کام ہوا ہے یا جو رائے دی جا رہی ہے مکمل اور جامع ہے؟

حیدر قریشی:ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ میں کہوں میں اپنی شاعری کے سارے امکانات کو پا چکا ہوں۔ہاں کچھ عرصہ سے شاعری کی روانی قائم نہیں رہی۔لیکن یہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔میرا پہلا شعری مجموعہ ''سلگتے خواب'' شاعری شروع کرنے سے ۲۰ سال کے بعد شائع ہوا۔اور چوتھا شعری مجموعہ ''دعائے دل'' چار سال کے عرصہ میں مکمل ہو گیا،جبکہ اس کی زیادہ تر شاعری ۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۶ء کے دو برسوں کی ہے۔اب پانچ مجموعوں کی کلیات مکمل کرنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ شاعری میں کچھ ٹھہراؤ سا آ گیا ہے۔لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ سب عارضی وقفے

ہوتے ہیں۔ویسے ممکن ہے میری نثر کی طرف اور انٹرنیٹ کی طرف توجہ زیادہ دینے کی وجہ سے شاعری نظر انداز ہورہی ہو۔باقی میری شاعری پر جتنا کام ہوا ہے،ہر جائزہ لینے والے کے اپنے مزاج کی بات ہے۔ممکن ہے کچھ اور لکھنے والے کسی اور زاویے سے بھی جائزہ لے سکیں۔

نذر خلیق: آپ غزل،نظم اور ماہیے میں سے کسے ترجیح دیں گے،کسے زیادہ اہم کہیں گے؟

حیدر قریشی: دراصل شاعری ہو یا دوسری نثری اصناف ہوں یہ سب اظہار کے مختلف پیمانے ہیں اور میں جب کوئی تخلیقی اظہار کرتا ہوں تو اس کی نوعیت کے مطابق اس کا پیمانہ از خود اسی فارم کی صورت میں آجاتا ہے۔اس لئے کسی کو بھی ترجیح نہیں دی جاسکتی۔البتہ یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اب پھر کہہ رہا ہوں کہ شاعری میری پہلی محبت ہے۔اس میں غزل اظہار کا پہلا پیمانہ تھا۔اس کے باوجود کسی صنف کو کسی دوسری پر ترجیح دینا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔

نذر خلیق: میں ابھی صرف شاعری تک محدود رہ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔آپ نے شاعری کے لئے صرف ان تین اصناف کو ہی چنا ہے۔متعدد دوسری نئی اور پرانی اصناف میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اس کی کیا وجہ ہے؟

حیدر قریشی: آپ پہلے سوال کو پھر گھما لائے ہیں۔میں نے جن اصناف میں اظہار کیا ہے وہی میرے مزاج سے مطابقت رکھتی تھیں۔باقی اصناف شاید میرے مزاج اور میرے تخلیقی تجربے سے میل نہ کھاتی ہوں گی۔کئی بار ایسا ہوا کہ مجھے کسی دوست کا خط آیا میں فلاں صنف کا ایک انتخاب ترتیب دے رہا ہوں۔آپ فوری طور پر اتنی رباعیات،یا اتنی کہہ مکرنیاں،یا کچھ اور بھیج دیں۔ان سارے دوستوں کی پر خلوص پیش کش کے جواب میں ہمیشہ میں نے معذرت کی ہے۔اگر کبھی اندر سے لہر اٹھے تو ہوسکتا ہے میں وہ شاعری بھی کرلوں جس کی مجھ سے فرمائش کی گئی تھی۔لیکن اگر اندر سے لہر نہیں اٹھتی تو محض چھپنے کے لئے یا کسی انتخاب میں شامل ہونے کے لئے

ایسی فرمائشی شاعری کرنا میرے لئے مشکل ہے۔

نذر خلیق: اپنی غزلوں کے معیار کے سلسلے میں آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

حیدر قریشی: اگرچہ اپنے اظہار کے لئے میں اس حد تک مطمئن ہوں کہ جو کہنا چاہتا ہوں کسی نہ کسی رنگ میں کہہ لیتا ہوں،تاہم مجھے کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ طبیعت کی موزونیت کے باوجود مجھے کوئی اچھا رہنما مل جاتا تو عروض کی تھوڑی سی سوجھ بوجھ میرے لئے مفید ثابت ہوتی۔مجھے کبھی کبھی اپنی اس کمی کا احساس ہوتا ہے۔

نذر خلیق: لیکن ماہیے کے اوزان کے سلسلے میں تو آپ نے خاصی عروضی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

حیدر قریشی: نہیں یار۔۔وہ تو ماہیے کی لے کو برقرار رکھنے کے لئے مجبوراً تھوڑی شد بد حاصل کرنا پڑی۔اس میں بھی میں نے لے کو بنیاد مان کر اس کی رینج میں آنے والے سارے معین اوزان اور مختلف اوزان کو یکجا کیا ہے۔بلکہ اس عمل کے دوران عروضی میدان میں اپنی کم علمی کا احساس اور بڑھ گیا ہے۔البتہ جب میں کئی اپنے جیسے عروض سے نابلد لوگوں کو بڑے ناز کے ساتھ ماہر عروض کے طور پر بولتے اور لکھتے دیکھتا ہوں تو ان کی بہادری پر حیرت بھی ہوتی ہے اور شرمندگی بھی۔

نذر خلیق: آپ کی ذاتی زندگی کا عکس آپ کی شاعری میں بہت دکھائی دیتا ہے۔ڈاکٹر شفیق احمد صاحب نے تو اس وجہ سے اپنے مضمون میں اس کا تفصیلی ذکر بھی کیا ہے۔

حیدر قریشی: شاعری کا ایک دور وہ تھا جب میں شعری روایات کے زیرِ اثر بیت برائے بیت کہہ رہا تھا۔لیکن یہ میری شاعری کا عبوری دور تھا جسے میں نے جلد عبور کرلیا۔اس کے بعد میری شاعری میرے گہرے مشاہدے یا ذاتی تجربات کا پرتو ہے۔اسی لئے اس میں میری ذاتی زندگی موجود ہے۔میری زندگی میں موجود لوگ بھی دکھائی دیتے ہیں۔

نذر خلیق: کیا اس لحاظ سے آپ ترقی پسندوں اور حقیقت پسندوں کے قریب نہیں آجاتے جوشاعری اورادب کوزندگی کا عکاس قرار دیتے ہیں؟

حیدر قریشی: شعروادب محض زندگی کے عکاس نہیں ہیں۔اس سے سوا بھی بہت کچھ ہیں۔تاہم جہاں تک ترقی پسندی کی اس روایت کا تعلق ہے کہ یہ زندگی کی بات کرتی ہے تو یقیناً میری شاعری اس لحاظ سے ترقی پسند روایت سے قریب ہے۔

نذر خلیق: لیکن آپ ڈاکٹر وزیر آغا کے زیرِ اثر ترقی پسندوں سے خاصے دور ہیں؟

حیدر قریشی: مزیدار سوال ہے۔دراصل میری ذاتی زندگی ایک مزدور کی زندگی ہے جس کی ترجمانی ترقی پسند کرتے ہیں۔ظاہر ہے میں ترقی پسندی کے اس سارے عمل سے پوری زندگی گزرا ہوں۔استحصالی قوتوں سے ہر قدم پر لڑائی لڑی ہے۔اگر میں ادبی سطح پر ترقی پسند حلقے میں شامل ہوتا تو اس کے نتیجہ میں میرے ہاں بلند آہنگ نعرہ بازی کی حد تک آجاتا۔اس لحاظ سے وزیر آغا کی فکر میرے لئے بہت بابرکت ثابت ہوئی کہ میں عملی زندگی میں ترقی پسند ہوکر خارجی محاذ پر لڑتا رہا اور ادبی طور پر میں نے خارج کے بجائے اپنے داخل پر توجہ مرکوز کی۔یوں میرے ہاں داخلیت اور خارجیت کا ایک توازن فطری طور پر آ گیا۔

نذر خلیق: لیکن داخلیت کی اہمیت کو ماننے والے تو ایک قدم آگے بڑھ کر باہر کو بھی اندر کا ہی ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔

حیدر قریشی: بھائی! یہ تو ادبی مباحث ہیں چلتے رہتے ہیں۔ہر علمی نکتہ میں کوئی نہ کوئی مفید یا مزے کی بات ہوتی ہے۔میں سلطان باہو کو پڑھ رہا تھا۔جب ان کے اس مصرعہ پر پہنچا ظاہر باطن عین ایانی ہُو ہُو پیا سنیوے ہُو۔۔۔تو مجھے لگا کہ داخل اور خارج کی بحث اپنی علمی اہمیت کے باوجود تخلیق کی اعلیٰ اور صوفیانہ سطح پر جا کر بے معنی ہو جاتی ہے۔لیکن ایسا صرف صوفیانہ تجربے جیسے تخلیقی لمحہ میں ہوتا ہے۔اس کے بعد پھر وہی مباحث ہیں اور ان پر سب کے اپنے اپنے

دلائل ہیں۔اوران کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

نذر خلیق: آپ نے افسانے بھی لکھے ہیں اور دو مجموعے ''روشنی کی بشارت'' اور ''قصے کہانیاں'' شائع ہوئے ہیں ان افسانوی مجموعوں سے جو تاثر ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے اساطیر سے بھی کام لیا ہے، تجریدی تجربے بھی کیے ہیں اور کہانی پن کا بھی خیال رکھا ہے تاہم عام قاری کو آپ کے افسانوں کو سمجھنے میں کہیں کہیں دشواری ہوتی ہے آپ نے افسانے کے جدید رجحانات کا خیال تو رکھا کہ یہ حالات کا تقاضہ تھا مگر قاری کو کیوں نظر انداز کیا؟

حیدر قریشی: میں نے تب افسانے کی دنیا میں قدم رکھا تھا جب وہاں نوبت تجریدی مارا ماری تک پہنچ گئی تھی۔مجھے اپنے عہد کے سینئیرز میں جوگندر پال اور رشید امجد نے بہت متاثر کیا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ میرے افسانوں پر آپ ان دونوں کے اثرات شاید ہی ڈھونڈ پائیں۔میں نے کہانی لکھتے ہوئے کہانی پن کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔میں ان لوگوں کو ٹھیک نہیں مانتا جنہوں نے جان بوجھ کر افسانہ میں کنفیوژن پیدا کئے۔اسے بے کنار تجرید بنا کر اپنی دانشوری کا رعب جماتے رہے،اور آخر اپنے انجام کو پہنچے۔انجام کو تو میں نے بھی پہنچنا ہے لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ میں عام طور پر ایک باقاعدہ آغاز سے باقاعدہ اختتام تک جاتا ہوں۔جوگندر پال کی کہانیوں سے میں نے جو تربیت حاصل کی ہے وہ یہ ہے کہ اپنا فن کا معیار برقرار رکھو۔قاری اگر بات کو پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا تو اس کو سمجھانے کے لئے،اس کو اپنے قریب لانے کے لئے اس کی ذہنی تربیت ایسی ہو کہ وہ اوپر اٹھ کر کہانی کی ادبی سطح تک آئے۔

نذر خلیق: لیکن آپ کی بعض کہانیاں بالکل سیدھی سادی سی ہیں۔جیسے **انکل انیس**،**بھولے کی پریشانی**،**شناخت**،**اعتراف** وغیرہ۔۔تو ان میں اور دوسری کہانیوں کے درمیان اظہار بیان کا ایسا فرق کیوں ہے؟

حیدر قریشی: ان ناموں میں آپ **کاکروچ** اور **بابا جمالی شاہ کا**

جلال بھی شامل کرلیں۔آپ کی بات درست ہے کہ یہ سیدھے بیانیہ کی کہانیاں ہیں۔میں نہیں جانتا یہ ایسے کیوں ہوئیں،میں تو اتنا جانتا ہوں کہ میں افسانہ لکھتے ہوئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کرتا۔بس جیسے کہانی نے ہونا ہوتا ہے ہوتی چلی جاتی ہے۔کبھی کہانی کہیں اٹک جاتی ہے تو میں اسے رستہ سجھا دیتا ہوں اور کبھی میں اٹک جاتا ہوں تو کہانی خود میری مدد کردیتی ہے۔نہ میں اکیلا کہانی لکھتا ہوں نہ صرف کہانی مجھے لکھتی ہے۔ہم دونوں مل کر سفر طے کرتے ہیں۔جیسا سفر ہوگا ویسا ہی افسانہ سامنے آئے گا۔

نذر خلیق: جن کہانیوں میں بیانیہ انداز واضح ہے وہ سب آپ کے دوسرے مجموعہ میں شامل ہیں۔پہلے مجموعہ میں ایسی کوئی کہانی شامل نہیں ہے۔تو کہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ پہلے مجموعہ کے بعد آپ کو محسوس ہوا کہ ان میں علامتوں کا استعمال زیادہ ہوگیا ہے اس لئے اب سادہ بیان پر توجہ دی جائے؟

حیدر قریشی: پکڑ آپ نے اچھی کی ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے جیسا آپ سوچ رہے ہیں۔**شناخت** میری ابتدائی کہانیوں میں سے ہے،یہ الگ بات کہ میں نے اسے پہلے مجموعہ میں شامل نہیں کیا تھا۔اسی طرح ایک کہانی جس کا ذکر میں بھول گیا **آپ بیتی** ہے۔یہ پہلے مجموعہ میں شامل ہے۔اسی طرح **کاکروچ** میرا پہلا مجموعہ چھپنے سے پہلے چھپ چکی تھی۔ہاں ایک اور کہانی سادہ بیانیہ کی یاد آگئی۔**دو کہانیوں کی ایک کہانی**۔۔۔یہ بھی میرے پہلے افسانوی مجموعہ سے پہلے لکھی جا چکی تھی اور عین اس وقت انشا کے افسانہ نمبر میں چھپی جب میرا پہلا مجموعہ ریلیز ہوا۔آپ دیکھیں کہ سادہ بیانیہ کی یہ کہانیاں بھی نیم علامتی رنگ لئے ہوئے ہیں۔اکہری نہیں ہیں۔

نذر خلیق: چلیں وجہ کچھ بھی رہی ہو یہ تو سامنے کی بات ہے کہ آپ کے پہلے افسانوی مجموعہ میں علامتی انداز زیادہ نمایاں ہے جبکہ دوسرے مجموعہ میں تقریباً ساری ہی سادہ بیانیہ کی

کہانیاں ہیں۔

حیدر قریشی: آپ یہ دیکھیں کہ کیا یہ کہانیاں جو بظاہر آپ کے بقول سادہ ہیں اپنے مجموعی تاثر میں کوئی نیا علامتی بُعد ظاہر کرتی ہیں یا نہیں؟

نذر خلیق: ''میری محبتیں'' آپ کے خاکوں کا مجموعہ ہے اس کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے افسانہ نگار حیدر قریشی کوئی اور ہے اور خاکہ نگار حیدر قریشی کوئی اور ہے یہاں آپ کا اسلوب افسانوی اسلوب سے بالکل مختلف ہے ایسا کیوں ہے؟

حیدر قریشی: اس سوال کا جواب دو جمع دو چار کی طرح تو نہیں دے سکتا۔اس کے جواب کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں ایسے پہلو بھی جو ایک دوسرے سے متصادم ہوں۔آپ کے سوال کے بعد غور کرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ میری بالکل ابتدائی کہانی **مامتا** اور اب تک کی آخری کہانی **مسکراہٹ کا عکس**،یہ دونوں کہانیاں براہِ راست ہمارے گھر کی کہانیاں ہیں۔**مامتا** میں،میں نے اپنی بیوی کے دکھ کو محسوس کیا تھا اور اس کی کہانی کو خود میں محسوس کر کے لکھا تھا۔ادبی زندگی میں یہ پہلی کہانی تھی جسے لکھنے کے بعد میں سچ مچ رویا تھا۔دوسری کہانی خود میرا اپنا نفسی تجربہ تھا جو یہاں جرمنی میں مجھے پیش آیا۔اسے آپ سوتی جاگتی حالت کا تجربہ کہہ سکتے ہیں۔اس تجربہ کے دوران مجھے جو کچھ پیش آیا وہی کچھ مجھے اس کہانی کو لکھنے کے بعد پیش آیا۔یعنی میں جی بھر کر رویا۔تو میرے بھائی میری کہانیوں میں تو میری زندگی کے کئی کردار آئے ہیں۔خاکہ نگاری اور افسانے کی اپنی اپنی حدود ہیں۔لیکن **مسکراہٹ کا عکس** میں تو جیسے یہ حدود ایک دوسرے سے مل گئی ہیں۔

نذر خلیق: کوئی اور کہانی جو آپ کی ذاتی زندگی سے متعلق ہو؟

حیدر قریشی: یار۔۔۔یہ تو آپ لوگوں کا کام ہے جیسے ڈاکٹر شفیق صاحب نے میری شاعری سے ذاتی زندگی کی نشاندہی کی ہے ویسے ہی آپ دوست ایسے اشارے تلاش

کریں۔ایسے اشارے تو تقریباً ہر کہانی میں کہیں نہ کہیں ملیں گے۔ویسے **گھٹن کا احساس** میرا ذاتی تجربہ ہے۔تب میرے دونوں بیٹے بھی میرے ساتھ تھے لیکن میں نے کہانی کو کہانی کے تقاضے کے مطابق لکھا ہے۔اس کہانی کو مکمل کرکے میں گویا اپنی موت پر آپ ہی رولیا تھا۔اسی طرح **آپ بیتی** کا ایک اہم حصہ واقعی آپ بیتی ہے۔ہوسکتا ہے ذاتی زندگی کے تجربات کا دباؤ مجھے خاکہ نگاری کی طرف لے جانے میں مددگار ثابت ہوا ہو۔

نذر خلیق: کوئی اور کہانی جسے مکمل کرکے آپ روئے ہوں؟

حیدر قریشی: نہیں بھائی صرف یہ تین کہانیاں تھیں جن کی تکمیل پر میں رویا تھا۔اب آپ یہ نہ کہہ دیں کہ آپ تو تین کہانیوں پر روئے تھے اور قاری بے چارہ میری ساری کہانیاں پڑھ کر روتا ہے کہ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔

نذر خلیق: کیا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ آپ کے افسانوں میں انسانی کردار حقیقت سے بہت قریب تھے اسی لئے آپ کو افسانے سے خاکہ نگاری کی طرف آتے ہوئے سہولت ہوئی؟

حیدر قریشی: بالکل کہہ سکتے ہیں۔کہیں اندر ہی اندر تدریجاً میں اسی طرف آرہا تھا۔ویسے اس کی فوری وجہ اباجی کی وفات تھی۔ان کی وفات کے بعد میں نے ان کے بارے میں چند باتوں کو یکجا کرنا چاہا تو وہ باتیں خاکہ کا روپ اختیار کرگئیں۔

نذر خلیق: یہ سارے خاکے لکھتے ہوئے آپ کو کیسا محسوس ہوتا رہا؟

حیدر قریشی: ویسا ہی محسوس ہوتا رہا جیسا اپنی کسی تخلیق کی تکمیل پر ہوتا تھا،یا شاید باقی تخلیقات سے تھوڑا سا زیادہ اچھا محسوس ہوتا رہا۔میرے والدین اور دوسرے عزیز کسی نہ کسی رنگ میں میری زندگی کی طرح میری دوسری تخلیقات میں بھی موجود تھے۔ان خاکوں میں وہ زیادہ نمایاں ہوکر شریک ہوئے۔ایک اور احساس شگفتگی اور مزاح کا ہے جسے بیشتر قارئین نے ظاہری سطح پر لیا ہے۔جبکہ میرا بنیادی اور ابتدائی تجربہ تو کرب کا تھا جو اس خاکہ نگاری کا محرک بنا۔سو آپ دیکھیں

کہ ان خاکوں کی شگفتگی میں کرب اور دکھ کی لہریں موجود ہیں۔کم از کم مجھے تو محسوس ہوتی رہتی ہیں۔

نذر خلیق: آپ کو خاکہ نگاری کے نتیجہ میں عزیزوں اور ادیبوں سے کس ردِعمل کا سامنا کرنا پڑا؟

حیدر قریشی: ہر ایک نے اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق ردِعمل ظاہر کیا۔عزیزوں میں سے بعض نے پسند کیا بعض نے ناپسند کیا۔ان کا خیال تھا کہ مجھے بعض امور کو اس طرح بیان نہیں کرنا چاہئے تھا۔اسی طرح بعض ادیبوں نے اپنے خاکوں کے بعض مندرجات پر زودرنجی کا اظہار کیا لیکن بیشتر نے خوشی ظاہر کی۔

نذر خلیق: عزیز واقارب کی جانب سے ناپسند کئے جانے کی وجوہات کیا رہیں؟

حیدر قریشی: ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ واقعاتی تسلسل میں جن عزیزوں کے منفی پہلو سامنے آئے ان کو غصہ آنا ہی تھا۔انہوں نے غصہ کیا۔ایک اور وجہ یہ ہے کہ ہمارے سوشل سیٹ اپ میں ہر مرنے والے کے بارے میں ایک فریم بنا ہوا ہے۔مرحوم بہت نیک پاک تھے (چاہے زندگی بھر کچھ بھی کرتے رہے ہوں)، بہت میٹھی زبان کے مالک تھے (چاہے فحش گالیاں کیوں نہ بکتے ہوں)۔کبھی کسی کو دکھ نہیں پہنچاتے تھے (چاہے کتنوں کو کتنے ہی دکھ کیوں نہ پہنچا چکے ہوں)۔اپنی سوسائٹی کے لئے جان تک دینے کو تیار تھے،وغیرہ۔۔۔تو ایسی سوسائٹی کے کلیشے قسم کے کرداروں کو نمایاں کرنا تو میرا مقصد نہیں تھا۔میں نے جن عزیزوں کے خاکے لکھے ان کو ان کی سوسائٹی کے حوالے سے نہیں بلکہ ان کے انسانی اوصاف اور ثقافتی وروحانی کردار کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی۔(روحانی اور مذہبی کے فرق کو ملحوظ رکھئے)۔چونکہ انسانی اوصاف اور ثقافتی و روحانی قدروں کی نوعیت کئی سوسائٹیوں میں مشترک ہے اسی لئے ان خاکوں کو ادبی دنیا میں بہت پذیرائی ملی۔

نذر خلیق: آپ کے خاکے اور ’’کھٹی میٹھی یادیں‘‘ پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپ کی زندگی کا ہر چھوٹا بڑا واقعہ غیر معمولی تھا اور آپ کو ہر واقعے کی چھوٹی چھوٹی جزئیات تک یاد رہ گئیں۔ بیان ہونے والے تقریباً پچاس فیصد واقعات کا تو میں خود چشم دید گواہ بھی ہوں۔ آخر آپ نے اتنی ساری باتوں کو یاد کیسے رکھا اور تمام واقعات کو ٹھیک ٹھیک اسی طرح بیان کیا جس طرح پیش آئے تھے۔ کیا آپ کو یقین تھا کہ ہماری عام زندگی کے کردار اتنی دلچسپی سے پڑھے جائیں گے اور ادب کا حصہ بھی بن جائیں گے؟

حیدر قریشی: خاکے تو زیادہ تر پاکستان میں ہی لکھے گئے تھے۔ یادیں ساری جرمنی میں لکھی ہیں۔ چونکہ جرمنی میں رہ کر پاکستان کی یاد زیادہ آتی ہے اس لئے ممکن ہے اسی وجہ سے یادوں میں اس حد تک جزئیات آتی چلی گئی ہوں۔ ویسے میرا حافظہ اتنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ شوگر ملز کی لیبارٹری میں ایک دوست تھے کریم بخش۔ بڑا جاندار دیہاتی اور کامیڈی کردار تھا۔ پھر بھاولپور کے سیٹھ عبیدالرحمٰن کا ذکر کرنا ضروری تھا۔ وہ مجھے ابھی تک یاد نہیں آئے تھے۔ اب یاد آرہے ہیں۔ اسی طرح میں نے ’’ابتدائی ادبی زمانہ‘‘ میں ماموں صادق کی نظم کا مصرعہ اپنی یادداشت کی بنا پر لکھا ہے ’’زندہ بادا ے ویت نام‘‘ لیکن اب ماموں صادق کی کچھ شاعری جمع کی ہے تو وہ مصرعہ یوں ملا ہے ’’زندہ بادا ے ویت کانگ‘‘۔ سو بہت کچھ یاد رہنے کے ساتھ بہت کچھ ذہن سے محو بھی ہوا ہے۔ کہیں کہیں سہو بلا ارادہ بھی ہوا ہے۔ تاہم اصل چیز یہ نہیں کہ جزئیات زیادہ ہیں اصل چیز یہ ہے کہ قاری ان میں ادبی سطح پر involve ہوتا ہے یا نہیں؟۔۔۔ عام زندگی ہی تو اصل زندگی ہے۔ اسی لئے یہ خاکے پسند کئے گئے، یادیں پسند کی گئیں۔

نذر خلیق: ’’فاصلے قربتیں‘‘ سے آپ ایک انشائیہ نگار کے طور پر ابھرے تاہم آپ نے بہت کم انشائیے لکھے ہیں حالانکہ آپ بہت اچھا انشائیہ لکھتے ہیں انشائیے کی فنی خوبیوں کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے انشائیہ نگاری پر بہت کم توجہ دی؟

حیدر قریشی: میں نے کسی ایک صنف پر خود کو مرکوز نہیں کر لیا۔ یہ ادبی زندگی کے مختلف مظاہر ہیں۔ مختلف پڑاؤ بھی کہہ لیجئے۔ جو ادبی اصناف میرے مزاج سے قریب تھیں، میں نے ان میں تھوڑا بہت تخلیقی اظہار کیا۔ میں نے جن اصناف میں بھی کچھ تخلیق کیا ہے ان کے بارے میں ایک بات بتا دوں کہ تب لکھنے کی تحریک ہوتی ہے جب مجھے اندر اور باہر سے ایک ساتھ انسپائریشن ہوتی ہے۔ اگر کبھی اندر سے آواز آرہی ہے لیکن باہر سے تحریک نہیں مل رہی تو بھی میں متحرک نہیں ہو پاتا۔ اسی طرح اگر باہر سے میں ذہنی طور پر لکھنے کے لئے آمادہ ہوں مگر اندر سے کچھ نہ ملے تو تب بھی کچھ نہیں لکھ پاتا۔ سو انشائیہ کے سلسلہ میں اندر یا باہر سے شاید ایسا کچھ ہو گیا ہو۔ تاہم جتنے انشائیے لکھے ہیں، وہ بھی کافی ہیں۔

نذر خلیق: آپ کے سفر نامہ عمرہ و حج ’’سوئے حجاز‘‘ میں بیان کی سادگی اور بے ساختہ پن تو موجود ہے ہی۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ سفر نامے کے لیے جو فنی لوازم ہوتے ہیں آپ نے ان کا پورا پورا خیال رکھا ہے؟

حیدر قریشی: میں نے ’’سوئے حجاز‘‘ لکھتے وقت کسی نوعیت کے فنی لوازم کا خیال نہیں رکھا۔ صرف ایک خیال رکھا کہ اپنی کیفیات اور اپنے تجربات کو جس حد تک ممکن ہے ادب اور سلیقے سے بیان کر دوں۔ میں روایتی سفر نامہ نگار نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو اب تک لندن، فرانس، ہالینڈ وغیرہ کے کتنے ہی رنگین و سنگین سفر نامے لکھ چکا ہوتا۔ آپ میرے سات عمروں کا احوال بغور دیکھیں۔ آپ کو ہر بار خانہ کعبہ کا ایک اور ہی جلوہ دکھائی دے گا۔ یہ قلم کار کا کمال نہیں ہے بلکہ خانہ کعبہ کا وہ حسن اور جلوہ ہے جو مجھ گنہگار پر ’’عالمِ نَو‘‘ کی طرح منکشف ہوتا رہا اور میرے لئے ایک انوکھے، بہت ہی انوکھے روحانی تجربہ کا باعث بنا۔

نذر خلیق: آپ کی تنقیدی کتب میں ’’ڈاکٹر وزیر آغا۔۔۔۔۔ عہد ساز شخصیت‘‘ ایک اہم کتاب ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر وزیر آغا ایک اہم ادبی حوالہ ہیں لیکن اور لوگ بھی تھے مثلاً احمد ندیم

قاسمی،فیض احمد فیض یا پھر احمد فراز وغیرہ ان کے بارے میں آپ نے کوئی کتاب کیوں نہ لکھی؟

حیدر قریشی: آغا جی کے بارے میں اگر میں نے لکھا تو اس لئے کہ ان سے ذہنی قربت تھی۔جن بزرگوں کے نام آپ نے لئے یا ایسے ہی دوسرے بزرگ تو ان کے ساتھ اس نوعیت کی ذہنی قربت پیدا نہیں ہوئی۔کسی کے بارے میں تب تک ادبی طور پر نہیں لکھا جا سکتا جب تک آپ ان سے ذہنی طور پر قریب نہ ہوں۔میں نے آغا جی کے بعد ہمت رائے شرما جی کے بارے میں بھی کتاب لکھی ہے۔ان کے ساتھ صرف ماہیے کی وجہ سے ایک محبت قائم ہوئی اور مجھے کام کرنے کی توفیق مل گئی۔

نذر خلیق: کیا ذہنی قربت کے نتیجہ میں ایسا نہیں ہوتا کہ پھر لکھتے وقت توصیفی رنگ چھا جاتا ہے؟

حیدر قریشی:اگر جائز توصیف ہے تو قطعاً بری بات نہیں ہے۔آغا جی کے خلاف پہلے ہی اتنا کچھ منفی لکھا جا چکا ہے،اس کا اثر زائل کرنے کے لئے اگر تھوڑا سا توصیفی اور وہ بھی جائز توصیفی لکھ دیا گیا تو یہ اچھی بات ہے۔اسی طرح ہمت رائے شرما جی تو ادب کیا،دنیا جہان سے الگ تھلگ ہو کر پڑے ہوئے تھے۔ان کی ادبی خدمات کو اگر میں نے ڈھونڈ کر توصیف کے ساتھ پیش کیا ہے تو اس میں بھی کچھ غلط نہیں لکھا۔

نذر خلیق: ہمت رائے شرما کا آپ نے نام لیا تو دھیان ماہیا کی طرف ہو گیا۔اردو ماہیا کے بارے میں آپ کے بیسیوں مقالات تو چھپ چکے ہیں تاہم آپ کی تنقیدی و تحقیقی کتب ’’اردو میں ماہیا نگاری‘‘،’’اردو ماہیا کی تحریک‘‘اور’’اردو ماہیے کے بانی۔۔۔ہمت رائے شرما‘‘اہم کتب ہیں۔ان کتب کے تناظر میں بھی کچھ فرمایئے آپ کو ایک مخصوص صنف شعر پر اتنی زیادہ توجہ کیوں دینا پڑی اور اگر توجہ دی تو کوئی اس کا مثبت نتیجہ بھی برآمد ہوا؟

حیدر قریشی: میرے تو خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ کبھی ماہیا پر اتنا کام کرنے کی

نوبت آئے گی۔بظاہر یہ ماہیا کے مخالفین کی ضد بازی تھی جن کی وجہ سے مجھے مسلسل لکھنا پڑا۔لیکن اب پلٹ کر دیکھتا ہوں تو خود بھی حیران ہوتا ہوں کہ مجھے اتنا کام کرنے کی توفیق مل گئی۔اور توفیق تو خدا کی طرف سے ملتی ہے،چاہے وہ کسی بہانے اور ذریعے سے عطا کر دے۔جہاں تک اس کے مثبت نتائج کا تعلق ہے۔۔۔میرا خیال ہے کہ گزشتہ نصف صدی کے عرصہ میں سہ مصرعی اصناف کے جتنے تجربے ہوئے،ماہیا ادبی طور پر ان سب سے بعد میں آیا اور ان سب سے زیادہ اردو میں رائج ہو گیا۔تو سہ مصرعی اصناف میں تو ماہیا کی ایک اہمیت بن گئی۔ہائیکو کی بھی اہمیت ہے۔لیکن آپ کو مزے کی بات بتاؤں،ہمارے ممتاز ماہیا نگار امین خیال جی اب جاپان گئے ہوئے ہیں اور ان کا پروگرام ہے کہ ہائیکو کے بدلہ میں جاپانی دوستوں کو ماہیے کا تحفہ دیا جائے۔وہ وہاں سے کوئی رسالہ نکالنے کا ارادہ بھی کر رہے ہیں۔دیکھیں مزید کیا ہوتا ہے۔

نذر خلیق: آپ نے گیارہ ستمبر۲۰۰۱ء کے بعد کے حالات کے پیش نظر **منظر** اور **پس منظر** عنوان کے ساتھ کالم نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔کیا ادب سے کالم نگاری کی طرف سفر کرنا ترقی معکوس نہیں لگتا؟

حیدر قریشی: پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد اور تیسری دنیا کے عوام کی اکثریت کی طرح نائن الیون کے بعد امریکی کارروائیوں پر میرے بھی وہی احساسات تھے جو دوسروں کے تھے۔لیکن مجھے یہ سب دیکھ کر چپ رہتے ہوئے شدید گھٹن ہونے لگی تھی۔میں نے بحیثیت شاعر اور ادیب کچھ لکھا لیکن مجھے وہ سب کچھ ادبی سطح پر اچھا نہیں لگا۔دکھ اور غصہ کی شدت ان میں غالب تھی۔چنانچہ میں نے ایسی ساری چیزیں ضائع کر دیں۔پھر اظہار کے نئے رستے سوچتا رہا۔اسی دوران کالم لکھنے کا خیال آیا اور ۲۵ کالم لکھ کر مجھے جیسے سکون آ گیا۔میں اسے ترقی معکوس نہیں سمجھتا۔ترقی معکوس تب ہوتی کہ میں ادب کو صحافت کی جگہ لے آتا۔میں اس سے بچ گیا۔اس کی بجائے میں نے صحافت کے ذریعہ کو اس کے باوقار مقام پر اختیار کیا۔یہی وجہ ہے کہ

میں اپنے کالموں کے مجموعہ کی اشاعت سے خوش ہوں۔ یہ بنیادی طور پر میرے صحافتی کالم ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ ان کی دیرپا حیثیت بنے گی۔ آنے والے وقت میں میرے اس لکھے کو شاید زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکے گا۔ اگر میں سنجیدگی سے کالم لکھنے کی بجائے افسانوں اور شاعری میں للکارتا رہتا تو شاید وہ ادبی لحاظ سے ترقی معکوس ہوتی۔

نذر خلیق: کیا آپ نے اپنے حالاتِ حاضرہ کے کالموں میں کوئی ایسی بات کہی جو عام طور پر ہماری صحافتی دنیا میں نہیں کہی جا رہی تھی؟

حیدر قریشی: ویسے تو میں نے بھی انہیں جذبات کا اظہار کیا ہے جن کا باقی سب لوگ کر رہے ہیں۔ اور میرا اصل مقصد بھی صرف دل کا بوجھ کم کرنا تھا۔ لیکن خدا کا فضل کہہ لیں یا کچھ اور کہ اس دوران مجھ سے تین ایسے اہم نکات کی نشاندہی ہوئی جو باقی سارے کالم نگاروں اور تجزیہ نگاروں سے مختلف ثابت ہوئے۔ میں ان کا ذکر اپنی کتاب **منظر اور پس منظر** کے پیش لفظ میں کر چکا ہوں۔ یہاں بھی ان کی نشاندہی کئے دیتا ہوں۔ ہند پاک تعلقات میں ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن کی باتیں تو ۵۵ سالہ دور میں دو تین بار ہوئی تھیں لیکن پورے جغرافیائی خطے میں یوروپی یونین کی طرز پر سارک یونین کو ڈھالنے کا مشورہ سب سے پہلے میں نے دیا اور ۲۲ جولائی ۲۰۰۲ء کو ایسے وقت میں دیا جب انڈو پاک ایٹمی جنگ کے دہانے پر کھڑے تھے۔ بعد میں یہی خیال کئی اطراف سے زیرِ بحث آنے لگا۔ آج بھی میں سمجھتا ہوں کہ اس خطہ کی نجات یورپی یونین کی طرز پر سارک کو موثر بنانے میں ہے ورنہ پورا خطہ بہت بڑی تباہی کی لپیٹ میں آ جائیگا۔

نذر خلیق: آپ کی یہ بات تو اب درست لگتی ہے۔ میں نے بھی گزشتہ سال آپ کی کالم نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے آپ کی اس تجویز پر لکھا تھا کہ اس پر عملدرآمد کے لئے دو تین صدیاں انتظار کرنا پڑے گا، لیکن واقعی اب تو اس کا امکان اتنا روشن ہو گیا ہے کہ اس کی معقولیت پر کھل کر بات کی جاسکتی ہے۔ دوسرے نکات کون سے تھے آپ کے؟

حیدر قریشی: دوسرا نکتہ یہ تھا کہ میں نے اپنے بچپن میں پڑھے ہوئے ایک اہم کتابچہ **الکفر ملة واحدة** کی بنیاد پر توجہ دلائی تھی کہ اسرائیل نے تو اپنے قیام کے ساتھ گریٹر اسرائیل کا نقشہ تیار کر لیا تھا۔ اس نقشہ میں مکہ اور مدینہ کو بھی اسرائیل کا حصہ دکھایا گیا تھا۔ میرے اس کالم کے بعد وقتی طور پر سہی لیکن ایک لہر اٹھی۔ معروف ٹی وی چینلز نے میرا حوالہ دیئے بغیر اس مسئلہ پر کافی بحث کی۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے اعتراف کیا کہ ہاں میں نے گریٹر اسرائیل کا نقشہ منگا لیا ہے اور اس میں ایسا ہی ظاہر کیا گیا ہے۔ اخبارات میں بھی اس انکشاف پر تشویش کا اظہار کیا گیا لیکن پھر سب خوابِ خرگوش میں چلے گئے۔

نذر خلیق: جی آپ نے درست کہا۔ اب اپنا تیسرا نکتہ بھی بیان کر دیجئے۔

حیدر قریشی: تیسرا نکتہ یہ تھا کہ موجودہ عالمی صورتحال کو میں نے محض تجزیاتی ذہن سے دیکھنے کے ساتھ مذہبی پیشینگوئیوں کے تناظر میں بھی دیکھنے کی کاوش کی۔ میں نے اپنے ایک کالم میں پیشین گوئی کا ایک اشارا دیا تو ایک معروف ٹی وی چینل کے پریزینٹر نے اگلے ہی روز اسی بنیاد پر اپنا ایک پروگرام پیش کر دیا لیکن ہوم ورک پورا نہ ہونے کی بنا پر ان کا سارا پروگرام غیر متعلق ہو گیا تھا۔ چنانچہ مذکورہ پروگرام سے اگلے روز ہی میں نے درپیش صورتحال کے تناظر میں مختلف مذہبی حوالہ جات پیش کر کے بتایا کہ اصل حوالے یہ ہیں۔ لگتا ہے میری بات اس پرزینٹر کو ایسی بھا گئی کہ وہ اب کئی پروگرام اسی حوالے سے پورے ہوم ورک کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ ویسے آپ کو مزے کی بات بتاؤں میں نے سارے حوالے کسی ہوم ورک کے بغیر آسانی سے پیش کر دیئے تھے۔ کیونکہ میں تو اپنی کہانی ''حوا کی تلاش'' میں بہت پہلے انہیں یکجا کر چکا تھا۔ یہ کہانی اوراق کے شمارہ فروری، مارچ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی کہانی میں سارے حوالے موجود ہیں۔

نذر خلیق: کیا ٹی وی چینل والوں نے کہیں آپ کا حوالہ دیا ہے؟

حیدر قریشی: میرے بھائی ملک کے مقتدر طبقوں کی طرح ہمارے اس نوعیت کے دانشور بھی کسی دوسرے کے کام کا اعتراف کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔یہ تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے دستیاب وسائل کی بنیاد پر میری تضحیک کا سامان کر دیں لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ میرے کام کی بنیادی اہمیت کو کسی رنگ میں بھی سامنے آنے دیتے۔الکٹرانک میڈیا بے شک بہت موثر ہے لیکن ہم جیسے گنہگار اسی طرح تاریخ میں اپنا بیان محفوظ کر لیتے ہیں۔اگر ہمارے مقتدر طبقوں کی یہ ”میں“ حائل نہ ہوتی تو عالمِ اسلام اس عبرتناک حال کو کیوں پہنچتا۔

نذر خلیق: ”جدید ادب“ اس وقت سے جاری ہے جب سے آپ نے اردو ادب کی دنیا میں قدم رکھا تھا اور کسی نہ کسی طرح جاری رہا ہے یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی وقفہ بھی ہوا۔اس کی مجلس ادارت میں ہر دور میں تبدیلی ہوتی رہی اس کی کیا ضرورت تھی کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جدید ادب کے حوالے سے آپ ادب کی خدمت کر رہے ہیں؟

حیدر قریشی: آپ نے ایک ہی سانس میں کئی سوال یکجا کر دئے ہیں۔جدید ادب کی مجلس ادارت میں اس لئے تبدیلی ہوتی رہی کہ ہر دور میں کچھ دوست پیچھے رہ جاتے تھے اور پورا ساتھ نہیں دے پاتے تھے۔اب بھی صرف وہی دوست ادارت میں شامل ہیں جو کسی نہ کسی رنگ میں جدید ادب کا کام کرتے ہیں۔باقی یہ بات تو میں جدید ادب کے نئے دور کے پہلے شمارہ کے اداریے میں واضح طور پر لکھ چکا ہوں کہ جدید ادب کا اجراء میری ادبی سرگرمی کا حصہ ہے اور ادب میرے نزدیک خود زندگی کی ایک اہم اور بامعنی سرگرمی ہے۔اس لئے یہ کوئی ادبی خدمت نہیں ہے۔رسالہ نکال کر ادب کی خدمت کرنے والے پہلے ہی بہت ہیں۔میں کوئی ادبی خدمت نہیں کر رہا بس اپنی زندگی اور ادبی زندگی بسر کر رہا ہوں۔

نذر خلیق: اس وقت جدید ادب کی جو پیش رفت ہے کہ پوری دنیا میں پڑھا جا رہا ہے اس کو آپ کیسا دیکھتے ہیں؟

حیدر قریشی: کسی حد تک جو بہت اچھی بات ہے۔ایک تو جدید ادب کا یہ کریڈٹ بن گیا کہ یہ اردو کا سب سے پہلا ادبی رسالہ ہے جو کتابی صورت میں چھپنے کے ساتھ انٹرنیٹ پر بھی مکمل طور پر دستیاب ہے۔جدید ادب سے پہلے بھی دو رسالے آن لائن ہوئے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنا مکمل شمارہ انٹرنیٹ پر پیش نہیں کیا۔بہت ہی تھوڑا اور منتخب میٹر انہوں نے دیا۔دوسرا یہ فائدہ ہوا کہ ادب سے متعلق دوست جدید ادب کا انٹرنیٹ پر مطالعہ کرنے لگے ہیں۔لیکن ابھی انٹرنیٹ کی دنیا پر معیاری اور اچھے ادب کے لوگ بہت کم تعداد میں ہیں۔تاہم یہی بہت ہے کہ ہم نے ایک مثالی ابتدا کر دی ہے۔

نذر خلیق: حیدر بھائی آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے اتنی سہولت کے ساتھ انٹرویو کرنے کا موقعہ عنایت کیا۔

حیدر قریشی: یار! شکریہ تو آپ کا ادا کرنا واجب ہے۔آپ نے انٹرویو کے روایتی سوال کرنے اور مجھے ان کے جواب دینے سے بچایا۔آپ کب پیدا ہوئے، کہاں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم۔۔۔، وغیرہ۔بے شک یہ سب بنیادی نوعیت کے اہم سوال ہیں لیکن ان کے جواب ایک سے زائد انٹرویوز میں دے چکا ہوں اسی لئے ایسے سوالات سے اب وحشت ہوتی ہے۔آپ نے ساری توجہ میری تخلیقات اور تحریرات تک مرکوز رکھی۔اس پر آپ کا دہرا شکریہ واجب ہوا۔ایک تو آپ آج کے عہد میں میرے اتنے اچھے قاری ثابت ہوئے اور دوسرے آپ نے اس طرح اس نوعیت کے سوال کرنے کی راہ سجھا دی۔بہرحال آپ کا بہت شکریہ!

☆☆☆

(مطبوعہ سہ ماہی توازن مالیگاؤں، شمارہ: ۴۰
و ”حریمِ ادب“ بورے والا۔کتاب نمبر ۲)

حیدرقریشی کے بارے میں
ان کے بعض دوستوں
اورعزیزوں کے انٹرویوز

یہ انٹرویوز اس سوالنامہ کے جواب پر مشتمل ہیں جو اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور کی ایم اے اردو کی طالبہ منزہ یاسمین نے حیدرقریشی پر اپنے تحقیقی مقالہ کی ضرورت کے تحت ان کے رشتہ داروں اور دوستوں کے لئے تیار کیا تھا۔

☆ ڈاکٹر سعادت سعید (انقرہ۔ترکی)

☆ پروفیسر فرحت نواز (رحیم یارخان، پاکستان)

☆ احمد سہیل (امریکہ)

☆ خورشید اقبال (۲۴ پرگنہ، مغربی بنگال۔انڈیا)

☆ رضیہ اسماعیل (برمنگھم، انگلینڈ)

☆ کاشف الہدیٰ (امریکہ)

☆ محمد آصف خواجہ (ڈنمارک)

☆ مبارکہ حیدر (اہلیہ)

☆ اعجاز حیدر (بھائی)

☆ رضوانہ حفیظ (بیٹی)

☆ شعیب حیدر (بیٹا)

☆ تسنیم حیدر (بہو)

☆ نادیہ حیدر (بہو)

پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید

اردو چیئر۔انقرہ یونیورسٹی،انقرہ۔ترکی

سوال: حیدر قریشی کو کس حیثیت سے جانتے ہیں؟انشائیہ نگار،افسانہ نگار،ماہیا نگار،نقاد،مدیر؟

جواب: میں انہیں شخصی طور پر جانتا ہوں۔وہ مخلص انسان ہیں۔انہوں نے ادب کو اوڑھنا بچھونا بنا کر علم و دانش کی ذمہ داریوں کا حق ادا کیا ہے۔وہ ایک ماہر انشائیہ نگار،عمدہ افسانہ نگار،مجدد ماہیا نگار،بے تکلف نظم گو،موثر غزل نویس،دردمند نقاد،ذمہ دار مدیر اور سچے اور کھرے انسان ہیں۔ان کی دوستیوں اور دشمنیوں کی بنیاد ادبی ہے۔

سوال: حیدر قریشی سے پہلی ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟

جواب: غالباً لاہور میرے غریب خانے پر۔۔۔فرحت نواز اور وہ اپنے رسالے جدید ادب کے سلسلے میں مجھ سے اشاعت کے لئے میرے مقالے لینے کے لئے آئے تھے۔وہ مقالے بعد میں ان کے اس سنجیدہ پرچے کی زینت بنے۔انہوں نے جیلانی کامران کے شعر و ادب پر بھی ایک نمبر نکالا تھا۔میرا ایک طویل مضمون ''جیلانی کامران کی نظمیں''اس میں چھپا تھا۔حلقہ ارباب ذوق کے حوالے سے بھی ان سے بہت سی ملاقاتیں رہیں۔اس زمانے میں لاہور میں میری شناخت نئی شاعری اور نئی تنقید کے تناظر میں کی گئی تھی۔اس زمانے میں جیلانی کامران،تبسم کاشمیری،مبارک احمد ہمارے مشترکہ دوست تھے۔حیدر قریشی نے بھی جدید ادب اور جدید تخلیق کاروں کا تعاقب

کر کے بہت سے تجربات جمع کر رکھے ہیں۔وہ ان سے وقتاً فوقتاً استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

سوال: حیدر قریشی کے بارے میں عمومی رائے؟

جواب: محنتی،مشقتی انسان ہیں۔انہوں نے اس مصرعہ کے مصداق کہ''نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا''زندگی کا قرض اتارنے کی حتیٰ المقدور کوشش کی ہے۔انسان دوستی ان کی گھٹی میں ہے۔وہ''وقت کے برگد تلے گھر سے گیان کی دھن میں نکلے ہوئے سادھو ہیں''۔

سوال: حیدر قریشی کے فن پر ناقدانہ رائے؟

جواب: معاصر اردو ادب کی بہت سی شخصیات اپنی داخلیت زدگی کی وجہ سے اپنے عہد کے تجربہ کردہ انسانوں کے مسائل کو گرفت میں لانے سے قاصر رہی ہیں۔حیدر قریشی نے اپنی نثری اور شعری تخلیقات میں ذات اور سماج کے معاملات کو یکجا کرنے کے لئے جدید اسالیبی تنوع سے بھرپور کام لیا ہے۔ان کا ادبی کام باسی کڑھی میں ابال کی مثال نہیں ہے۔حیدر قریشی نے جدید اردو نثر کو تازہ کاری کی ایک پُر تاثیر لہر سے آشنا کیا ہے۔حیدر قریشی کی شاعری کے حوالے دو بھولے بسرے شاعروں شکیب جلالی اور اقبال ساجد کی یاد دلاتے ہیں۔روایتی نقاد اور محقق ان کی تخلیقات کے اسی پہلو کو رد کرتے ہیں۔اردو شاعری کے اس طرزِ بیان کے ڈانڈے نظیرا کبرآبادی کی شعری روایت سے ملتے نظر آتے ہیں۔اگر وہ نثری نظم لکھنے والے شاعروں کی سنجیدہ تخلیقات کو قابلِ توجہ سمجھیں تو انہیں وہاں بھی مذکورہ روایات کے بہت سے سلسلے دکھائی دیں گے۔ہمارے عہد کے جدید شاعروں نے مواد کے اعتبار سے نثر اور نظم کی تفریق کو روا نہیں رکھا۔ان کے متعدد ماہیے ان کے دیہاتی اور قصباتی ماضی کی یادوں اور روزمرہ معمولات کی داستان کہتے ہوئے زندگی اور انسان سے ان کے عشق کی داستان سنا رہے ہیں۔حیدر قریشی نے دورِ جدید کے سائنسی اور تیکنیکی انقلاب اور تہذیبِ نو کی کنہ کی تنقیدی تفہیم کی ہے۔اس حوالے سے ان کے متعدد افسانے قارئین سے بھرپور داد حاصل کر چکے ہیں۔

سوال: اردو ادب میں حیدر قریشی کا مقام؟

جواب: ان کے ادبی مقام کا تعین تو ادبی تاریخ کرے گی۔ میرے خیال میں انہوں نے زندہ رہنے والے ادب کی تخلیق کی ہے۔

سوال: حیدر قریشی کی شخصیت کا منفرد پہلو؟

جواب: ان کی انسان دوستی نے ایک زمانے کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ وہ دوست نوازی سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔

سوال: حیدر قریشی کے فن کا منفی پہلو؟

جواب: ان کی حد سے بڑھی حساسیت میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں انہیں غیر ضروری ذاتی مباحثوں سے گریز کرنا چاہیئے۔

☆☆☆

(۲۲ نومبر ۲۰۰۲ء)

فرحت نواز شیخ

لیکچرر شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج برائے خواتین۔ رحیم یار خان

سوال: حیدر قریشی سے تعلق؟

جواب: بنیادی طور پر کچھ استاد شاگرد قسم کا تعلق تھا لیکن اسے آپ بہت اچھی دوستی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایسی دوستی جس میں احترام اور گہرا اعتماد ہو۔

سوال: حیدر قریشی کو کس حیثیت سے جانتی ہیں؟ انشائیہ نگار، افسانہ نگار، ماہیا نگار، نقاد، مدیر؟

جواب: ان کی ہر ادبی حیثیت سے انہیں جانتی ہوں۔ ان کی غزلیں، نظمیں ۔۔ ان کے ماہیے ۔۔ یہ سب تو میرے سامنے تخلیق ہوتے رہے۔ افسانے، انشائیے، تھوڑے بہت تنقیدی مضامین بھی میرے سامنے کی بات ہیں لیکن ماہیے پر حیدر قریشی کا اہم اور بنیادی تنقیدی کام جرمنی جا کر ہوا۔ اسی طرح ان کی خاکہ نگاری اور سفر نامہ نگاری بھی ہمارے رابطہ نہ رہنے کے بعد کی چیزیں ہیں۔ اور ان کی ان ساری حیثیتوں کے بارے میں مجھے خوشی ہے کہ وہ اپنا ایک کم سے کم ادبی معیار قائم رکھتے ہیں۔ ان کا یہ کم سے کم معیار اہمیت رکھتا ہے

اس اہمیت کا اندازہ تدریجاً بڑھتا جائے گا۔ وہ یقیناً اردو کے اس دور کے ایک اہم شاعر اور ادیب ہیں۔ جہاں تک ان کی مدیرانہ حیثیت کا تعلق ہے، ''جدید ادب'' کے مدیر کی حیثیت سے انہوں نے اچھا کام کیا تھا۔ میں خود اس رسالہ میں ان کے ساتھ ادارت میں شامل تھی۔

سوال: حیدرقریشی سے پہلی ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟

جواب: جب حیدرقریشی کے والدین رحیم یارخان میں رہتے تھے تب ہم لوگ بھی کچھ عرصہ کے لئے وہاں رہے، دونوں گھروں کا تھوڑا بہت ملنا جلنا تھا۔ یہ ہمارا بچپن تھا۔لیکن سچی بات ہے مجھے اُس زمانے کی کوئی بات یادنہیں ۔ پھر حیدرقریشی کے والد خانپور شفٹ ہو گئے۔اتفاق سے کچھ عرصہ کے لئے میرے والد کا سرکاری تبادلہ بھی خانپور میں ہوگیا اور مزید اتفاق یہ کہ والدصاحب کا ہسپتال، ہماری سرکاری رہائش اور حیدرقریشی کا گھر تھوڑے سے فاصلے پر تھے۔اس لئے دونوں گھروں کا ایک دوسرے کے ہاں تھوڑا بہت آنا جانا تھا۔

۱۹۷۰ء میں جب قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن ہوئے تھے گورنمنٹ گرلز ہائی سکول خانپور میں جو لیڈیز پولنگ بوتھ بنایا گیا تھا وہاں میری بڑی بہن کی پیپلز پارٹی کی طرف سے ڈیوٹی تھی اور میں ان کے ساتھ گئی تھی۔اسی پولنگ بوتھ کے باہر پیپلز پارٹی کے کیمپ میں حیدرقریشی فعال کارکن کے طور پر موجود تھے۔اس کے باوجود ہمارا رابطہ رسمی ہائے ہیلو تک ہی رہا۔ہم لوگ ایک بار پھر رحیم یارخان چلے گئے۔اسی دوران میں خواتین کے بعض رسائل میں اور حیدرقریشی ادبی رسائل میں تھوڑا تھوڑا چھپنے لگے تھے۔اور جب حیدرقریشی نے ''جدیدادب'' کے اجراء کا ارادہ کیا تو مجھ سے رابطہ کیا۔''جدیدادب'' کے اجراء کے بعد ہمارا رابطہ زیادہ ہوگیا لیکن میرے لئے یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ ہماری پہلی ملاقات کب ہوئی تھی۔

سوال: پہلی ملاقات کا تاثر؟

جواب: پہلی ملاقات کا تو تعین ہی نہیں ہوا، تاثر کیا بتاؤں؟۔۔ہاں اس تعلق کے بارے میں ایک بات بتادوں کہ ہم سال کے گیارہ مہینے لڑتے رہتے تھے اور ایک مہینہ ہمارا صلح صفائی میں گزرتا تھا۔اگر کبھی سچ مچ جھگڑا زیادہ ہوگیا تو ہماری صلح کے لئے مبارکہ بیچ میں آجاتی تھیں۔اگر میں یہ کہوں کہ مبارکہ، حیدرقریشی کی بیوی سے زیادہ ان کی اچھی دوست ہیں تو غلط نہ ہوگا۔اور جتنی اُن

کی دوست ہیں اتنی ہی میری دوست ہیں۔

سوال: حیدرقریشی کے بارے میں عمومی رائے؟

جواب: انتہائی مخلص سے بھی زیادہ مخلص دوست

سوال: حیدرقریشی کے فن پر ناقدانہ رائے؟

جواب: آنے والا وقت تسلیم کرے گا کہ حیدرقریشی کے اپنے عہد نے ان کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا تھا۔اور آنے والا وقت پورا انصاف کرے گا۔

سوال: اردو ادب میں حیدرقریشی کا مقام؟

جواب: اگر مغربی ممالک میں قیام پذیر اردو کے سارے شاعروں، ادیبوں کا جائزہ لیا جائے تو اپنے اپنے اصنافی دائرے میں سب اچھا کام کر رہے ہیں۔کوئی شاعر ہے، تو کوئی افسانہ نگار۔۔کوئی نقاد اور محقق ہے تو کوئی خاکہ نگار۔۔۔کوئی انشائیہ نگار ہے تو کوئی سفرنامہ نگار۔۔۔کوئی سوانح نگار ہے تو کوئی یادنگار۔۔۔بعض ادباء نے ایک سے زیادہ اصناف میں بھی کام کیا ہے لیکن حیدرقریشی نے جتنا کثیر الجہت کام کیا ہے اور اس میں جس طرح اپنا عمومی معیار بھی برقرار رکھا ہے اس کے باعث مغربی ممالک کے شاعروں اور ادیبوں میں تو حیدرقریشی کا بالکل الگ ایک مقام بن چکا ہے جس میں وہاں کوئی بھی ان کا مدمقابل دکھائی نہیں دیتا۔شاید اسی لئے وہاں کے بعض کمزور تخلیق کاروں نے مل کر حیدرقریشی کے خلاف ذاتیات کی حد پر آکر ایک مہم چلائی تھی۔ویسے شاید حیدرقریشی خود کو کسی خاص خانے میں دیکھنے کے بجائے ادب کے مرکزی دھارے میں شمار ہونے کو بہتر سمجھیں گے۔

سوال: حیدرقریشی کی شخصیت کا منفرد پہلو؟

جواب: ان کے بارے لوگ جو کچھ سمجھیں اور کہیں لیکن مجھے ان کے اندر ہمیشہ کوئی ملنگ سا محسوس ہوتا رہا ہے۔ظاہرداری کے اعتبار سے تو شاید ان پر کئی اعتراض کئے جاسکیں۔ان پر شدید

تنقید بھی کی جا سکے۔لیکن مجھے ان کے اندر کے جس ملنگ یا فقیر کا احساس ہوتا رہا ہے، میں خود کئی بار اس سے ڈری ہوں۔حیدر قریشی نے کبھی مجھے بد دعا نہیں دی لیکن فقیر کی خاموشی بھی کبھی کبھار ڈراتی رہی ہے۔ایک دو بار تو میں نے انہیں کہا بھی تھا کہ بد دعا مت دینا۔دی ہیں تو واپس لے لیں۔دراصل اس موضوع پر میرے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے لیکن میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ویسے خدا کا شکر ہے کہ حیدر قریشی جرمنی چلے گئے۔

سوال: حیدر قریشی کے فن کا منفرد پہلو؟

جواب: حیدر قریشی اپنی تمام تخلیقات میں خود سانس لیتے ہوئے اور زندگی بسر کرتے ہوئے موجود ہیں۔خود اس طرح کہ ان کی اپنی زندگی کے ساتھ ان سے وابستہ تمام اہم کردار بھی ان کی تخلیقات میں موجود ہیں۔بعض کردار تھوڑے سے پردے میں ہیں بعض کھلی کتاب کی طرح ہیں۔لیکن ایسی کھلی کتاب جس کے معانی مسلسل کھلتے چلے جاتے ہیں۔دوسروں کے ہاں خاکوں اور یادوں کے باب میں ایسی زندگی مل جاتی ہے کہ وہاں ان کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔لیکن حیدر قریشی تو شاعری،افسانہ،انشائیہ،سفرنامہ،۔۔۔حتیٰ کہ انٹرویوز تک میں بھی کسی مصنوعی اور نام نہاد مثالی زندگی کا نقشہ پیش کرنے کے بجائے اپنی زندگی،اپنے رشتوں،اپنی محبتوں کو ہی بیان کرتے ہیں اور انداز بیان ایسا کہ آپ بیتی۔۔۔۔جگ بیتی بن جاتی ہے۔اپنی تمام تخلیقات میں اس طرح سے زندگی بسر کرنا اس عہد کے تمام شاعروں اور ادیبوں میں حیدر قریشی کی الگ پہچان ہے۔اس زاویے سے ان کی تمام تخلیقات خود ایک تحقیقی مطالعہ کا تقاضہ کرتی ہیں۔

سوال: حیدر قریشی کے فن کا منفی پہلو؟

جواب: حیدر قریشی کے فن کا منفی پہلو یہ ہے کہ ان دنوں وہ کچھ نہیں لکھ رہے۔ایک سال سے بالکل خاموش ہیں۔دراصل لندن اور جرمنی میں ان کے خلاف ایک سازش تیار کی گئی تھی۔اسی کے تحت ان کے خلاف گری ہوئی ذاتیات کی حد تک جا کر دشنام دہی کی گئی۔سازش کا تو مقصد ہی یہ تھا

کہ حیدر قریشی ادبی دنیا چھوڑ دیں۔حیدر قریشی کو اس سازش کو سمجھنا چاہئے اور اس کے اصل محرکوں کے منشاء کو سمجھ کر پھر سے تخلیقی طور پر سرگرم ہونا چاہئے۔

☆☆☆

(۳/اگست۲۰۰۲ء)

احمد سہیل (امریکہ)

سوال: حیدرقریشی سے تعلق؟

جواب: حیدرقریشی کو میں تب سے جانتا ہوں جب وہ ''ادبِ لطیف'' لاہور میں شائع ہونا شروع ہوئے۔

سوال: حیدرقریشی کو کس حیثیت سے جانتے ہیں؟ (انشائیہ نگار/افسانہ نگار/ماہیا نگار/ نقاد / مدیر)

جواب: حیدرقریشی کو میں انشائیہ نگار، افسانہ نگار، فکاہیہ نگار، نقاد اور مدیر سب ہی حیثیتوں سے جانتا ہوں۔

سوال : حیدرقریشی سے پہلی ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟

جواب: حیدرقریشی سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

سوال: حیدرقریشی کے بارے میں عمومی رائے؟

جواب: کثیرالجہت لکھنے والے ہیں۔تحریر بہت دلکش ہوتی ہے۔

سوال: حیدرقریشی کے فن پر ناقدانہ رائے؟

جواب: ان کی تحریروں میں کشمکشِ زیست غالب عنصر ہے۔مگر ان کی شاعری میں تہذیبی جلا

وطنی اور سیاسی متعلقات بھی ہیں۔ان کے شعری اسلوب میں سرائیکی لسانیات کا اردو میں نفوذ بھی نظر آتا ہے۔شعری صنف ''ماہیا'' پر ان کا کام بڑے معرکے کا ہے۔وہ خواب گر بھی ہیں اور خواب شکن بھی۔۔۔۔۔

سوال: اردو ادب میں حیدرقریشی کا مقام؟

جواب: ان کا مقام اردو میں ستّر (۷۰) کی دہائی کے بعد والی نسل میں شامل ہے۔

سوال: حیدرقریشی کی شخصیت کا منفرد پہلو؟

جواب: ٹھنڈے دماغ کے ہیں دوسروں کی مدد کر کے خوش ہوتے ہیں۔

سوال: حیدرقریشی کے فن کا منفرد پہلو؟

جواب اظہارِ خیال کے سلسلے میں جری اور نڈر ہیں۔اپنی بات کہنا جانتے ہیں۔

سوال: حیدرقریشی کے فن کا منفی پہلو؟

جواب: مختلف اصناف ادب کو اپنایا ہوا ہے لہٰذا نقادوں کو ان کے بارے میں یکسوئی سے اور مربوط طور پر کوئی رائے دینے میں مشکل ہوگی۔ان کا یہ وسیع کینوس ان کے لئے منفی ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

(۲۰ر نومبر ۲۰۰۲ء)

خورشید اقبال

معروف شاعر،اور مینیجنگ ڈائریکٹر

www.urdudost.com

سوال : حیدرقریشی سے تعلق؟

جواب: حیدرقریشی میرے بہت اچھے دوستوں میں سے ہیں۔

سوال: حیدرقریشی کوکس حیثیت سے جانتے ہیں؟(انشائیہ نگار/افسانہ نگار/ماہیا نگار / نقاد / مدیر)

جواب : حیدر بھائی کو میں مندرجہ بالاتقریباً ہرحیثیت سے جانتا ہوں۔شروع شروع میں، میں انہیں صرف شاعر کی حیثیت سے ہی جانتا تھا لیکن جیسے جیسے میں ان کے قریب آتا گیا مجھے ان کی شخصیت کی قوس قزح میں بکھرے رنگ ایک ایک کرتے دکھائی دیتے گئے۔اورآج میں انہیں ایک ہرفن مولاقسم کے ادیب کی حیثیت سے جانتا ہوں۔

سوال : حیدرقریشی سے پہلی ملاقات کب اور کیسے ہوئی ؟

جواب : حیدر بھائی سے میں کبھی نہیں ملا ۔۔۔۔ ان سے میری پہلی ملاقات (اگر اسے ملاقات کا نام دیا جاسکے) کمپیوٹر کے اسکرین پر ہوئی۔اس دن اچانک (غالباً پچھلے سال مارچ کی بات ہے) مجھے ان کا ای میل ملا جوانہوں نے میرے ویب سائٹ www.urdudost.com کو دیکھنے کے بعداس کی تعریف میں لکھا تھا۔یوں تو اس سلسلے میں روزانہ ہی کچھ لوگوں کے ای میل

ملا کرتے ہیں لیکن اس دن خط کے نیچے حیدرقریشی لکھا دیکھ کر میں چونک گیا۔اور میں نے فوراً جوابی ای میل بھیجا جس میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کا تعلق جرمنی سے ہے؟ کیا آپ وہی مشہور شاعر حیدرقریشی ہیں؟ دوسرے دن ان کا ای میل آیا جس سے مجھے پتہ چلا کہ میرا شک درست تھا۔وہ وہی حیدرقریشی تھے۔ مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔اردودوست ڈاٹ کام ان دنوں بالکل نیا نیا تھا اور حیدر بھائی وہ پہلی بڑی اور مشہور شخصیت تھے جنھوں نے میری اس کاوش کو سراہا تھا اور میری حوصلہ افزائی کی تھی۔وہ دن اور آج کا دن۔۔۔ہم کبھی ای میل کے ذریعہ،کبھی یاہو کے چاٹ روم میں اور کبھی فون پر ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں (اگر آپ انہیں ملنا کہہ سکیں۔۔۔ میں تو ملاقات ہی سمجھتا ہوں۔۔۔بھئی virtual reality کا زمانہ ہے)۔

سوال: پہلی ملاقات کا تاثر؟

جواب: جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ اب تک ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔۔۔اس لئے اس سوال کا فی الحال کوئی جواب میرے پاس نہیں۔

سوال: حیدرقریشی کے بارے میں عمومی رائے؟

جواب: کسی کے بارے میں اس قسم کی کوئی رائے قائم کرنے کے لئے اس سے قریب ہونا بہت ضروری ہے۔میں حیدرصاحب سے کبھی ملا نہیں۔بس ان کی تصویر دیکھی ہے،فون پر ان کی آوازسنی ہےاور بذریعہ ڈاک بھیجے گئے چند خطوط میں ان کی تحریر دیکھی ہے۔ایسے میں بھلا ان کے بارے میں کیا رائے قائم کروں۔

سوال: حیدرقریشی کے فن پر ناقدانہ رائے؟

جواب: حیدرصاحب ایک ہرفن مولاقسم کے ادیب ہیں۔وہ ایک اچھے ہی نہیں بلکہ بہت اچھے غزل گو ہیں۔ان کی غزلوں میں روایت اور جدت ساتھ ساتھ چلتی ہیں جن میں خیال کی ندرت، اظہار کی دلکشی اور زبان کی شگفتگی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔وہ الفاظ کے استعمال کا فن

بخوبی جانتے ہیں اوران کی پوری شاعری خوبصورت الفاظ کے انتخاب سے بھری ہوئی ہے۔ماہیے کے سلسلے میں انہوں نے جو کچھ کیا اس بنا پر انہیں ''بابائے ماہیا'' کہلانے کا پورا پورا حق ہے۔انہوں نے نہ صرف ماہیے کے اصل اوزان متعین کئے اور عالمگیر پیمانے پر انہیں رائج کرانے کے لئے بھرپور تحریک چلائی بلکہ خود بھی انہوں نے بڑے اچھے ماہیے کہے۔

بحیثیت نثر نگار بھی حیدر قریشی بے حد کامیاب رہے ہیں۔اپنے بزرگوں، رشتے داروں اور دوستوں کے لفظی خاکوں پر مشتمل ان کی کتاب ''میری محبتیں'' اردو زبان میں شاید اپنے انداز کی منفرد کتاب ہے۔بچپن اور جوانی کی حسین یادوں پر مشتمل ان کی کتاب ''کھٹی میٹھی یادیں''، اوران کے انشائیوں پر مشتمل ''فاصلے قربتیں'' بھی اتنے دلچسپ ہیں کہ قاری ان میں کھو جاتا ہے۔اپنے سفرنامہ ''سوئے حجاز'' میں انہوں نے ایسی حسین منظرکشی کی ہے کہ پڑھنے والا جیسے خود حرم شریف میں پہونچ جاتا ہے۔

سوال: اردو ادب میں حیدر قریشی کا مقام؟

جواب: بڑا مشکل سوال ہے۔میں اتنی بڑی حیثیت نہیں رکھتا کہ ادب میں کسی کا مقام متعین کر سکوں۔ویسے بھی ادب میں مقام متعین کرنا وقت کا کام ہے۔وقت ہمیشہ یہ فیصلہ خود صادر کرتا ہے۔مرزا غالب کی مثال لیجئے۔ان کی زندگی میں انہیں وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔لیکن وقت نے آخر اپنا فیصلہ سنایا اور غالب کو اس بلند ترین مقام پر پہونچادیا جہاں شاید وہ تب تک رہیں گے جب تک اردو زباں رہے گی۔اور دوسری طرف ذوقؔ جو اس زمانے کے شاعر اعظم تھے آج ان کا مقام بھی ہماری نظروں کے سامنے ہے۔حیدر صاحب کے بارے میں میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ وہ آج کے ایک بہت ہی اچھے شاعر و ادیب ہیں اوران کے مخالفین اور معترضین لاکھ کوششیں کریں وقت انہیں ان کا صحیح مقام خود بخشے گا۔

سوال: حیدر قریشی کی شخصیت کا منفرد پہلو؟

جواب: یوں تو حیدر قریشی زندگی سے بھرپور ایک باغ و بہار شخصیت کا نام ہے جو اپنی غزلوں، نظموں، خاکوں، انشائیوں اور افسانوں سے جابجا جھانکتی نظر آتی ہے۔لیکن اس شخصیت کی جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ ہے اس کی بے باکی۔حیدر قریشی چاہے جس موضوع پر بھی لکھ رہے ہوں وہ کھل کر لکھتے ہیں۔اپنے جذبات کو بلا جھجھک کاغذ پر منتقل کر دیتے ہیں۔خواہ اپنا ذکر کر رہے ہوں یا اپنے بزرگوں کا، وہ کچھ بھی نہیں چھپاتے اور حقیقت کو بیان کر دیتے ہیں چاہے وہ جتنی کڑوی ہو۔وہ یہ کبھی نہیں سوچتے کہ پڑھنے والا ان کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا۔

سوال: حیدر قریشی کے فن کا منفرد پہلو؟

جواب: حیدر قریشی کی شخصیت کا منفرد پہلو ہی ان کے فن کے منفرد پہلو کا ذمہ دار ہے۔۔۔اور وہ ہے بے باکی اور صاف گوئی۔ان کی غزلوں، نظموں، ماہیوں، افسانوں اور خاکوں میں سے اگر اس بیباکی کو نکال دیا جائے تو ان کے فن کا سارا حسن ماند پڑجائے گا، سارے رنگ پھیکے پڑ جائیں گے۔

سوال: حیدر قریشی کے فن کا منفی پہلو؟

جواب: سب سے مشکل سوال ہے۔جب کوئی کسی فنکار کو پسند کرتا ہے تو اس کے فن میں منفی پہلو تلاش کرنا بڑا مشکل ہوجاتا ہے۔مجھے حیدر قریشی کی تخلیقات بے حد پسند ہیں۔ہاں ان کے کچھ افسانے مجھے پسند نہیں آئے لیکن اس میں قصور حیدر صاحب کا نہیں۔یہ افسانے غالباً جدیدیت کی تحریک کے اس دور میں لکھے گئے جب ادب علامات اور استعارات کا لفظی گورکھ دھندا بنا ہوا تھا۔اس دور کے افسانوں میں پلاٹ، کہانی، مکالمے اور منظر نگاری بس نام کو ہوتے تھے اور اگر کچھ ہوتا تھا تو بس لفظ ہی لفظ۔۔۔مبہم اور غیر واضح۔حیدر صاحب کے بعض افسانوں میں یہ ٹرینڈ پایا جاتا ہے۔☆☆☆

(۳ر نومبر ۲۰۰۲ء)

رضیہ اسماعیل (برمنگھم)

سوال: حیدرقریشی سے تعلق؟

جواب: ادبی قبیلے کے افراد میں سے ایک بہت اچھا ادبی دوست

سوال: حیدرقریشی کو کس حیثیت سے جانتی ہیں؟ (انشائیہ نگار، افسانہ نگار، ماہیہ نگار، نقاد، مدیر)

جواب: ان پانچوں حیثیتوں کے حوالے سے بھی اور غزل گو، نظم گو، سفرنامہ نگار، خاکہ نگار، سوانح نگار کی حیثیتوں سے بھی جانتی ہیں۔ یہ تو کثیر الجہت ادیب ہیں۔

سوال: حیدرقریشی سے پہلی ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟

جواب: ان کے ماہیوں کی کتاب ''محبت کے پھول'' کو پڑھ کر میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔

سوال: پہلی ملاقات کا تاثر؟

جواب: ''محبت کے پھول'' پڑھ کر میں اتنی متاثر ہوئی کہ میں نے خود ماہیے کہنے شروع کر دیئے اور اب میرے ماہیوں کا مجموعہ ''پیپل کی چھاؤں میں'' چھپ چکا ہے۔ اس کا پیش لفظ میں نے ان سے ہی لکھوایا ہے۔

سوال: حیدرقریشی کے بارے میں عمومی رائے؟

جواب: معاملات کے کھرے، ذہنی طور پر اور تخلیقی طور پر انتہائی فعال،۔۔۔ان کی عمر کے لوگوں میں سے شاید ہی کوئی ہو جو اتنا جینوئن بھی ہو اور جدید ٹیکنالوجی سے اس حد تک منسلک ہو۔ انٹرنیٹ

پر حیدرقریشی کی سرگرمیاں حیران کن اور لائق رشک ہیں۔

سوال: حیدرقریشی کے فن پر ناقدانہ رائے؟

جواب: میں ان کی قاری ہوں اور قاری کی حیثیت سے مجھے ان کی ساری تحریریں اچھی لگی ہیں، ان کے خاکوں اور ماہیوں نے براہ راست متاثر کیا۔ ان کی تحریروں میں اور بالخصوص افسانوں میں جہاں صوفیانہ ٹچ آتا ہے وہاں ان کا فن اپنے کمال پر ہوتا ہے۔

سوال: اردو ادب میں حیدرقریشی کا مقام؟

جواب: بہت مستند شاعر اور ادیب۔ ادب کی اونچی مسند پر ہیں۔ ان کی تحریروں میں بہت جان ہے۔: ماہیے پر تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی تینوں لحاظ سے ان کا کام تاریخی نوعیت کا ہے۔

سوال: حیدرقریشی کی شخصیت کا منفرد پہلو؟

جواب: بے لوث، صاف گو اور جینوئن انسان اور ادیب

سوال: حیدرقریشی کے فن کا منفرد پہلو؟

جواب: ویسے تو ان کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی منفرد خوبی ہے، لیکن ماہیے اور خاکوں، یادوں کے حوالے سے ہونے والے ان کے کام کا مستقل حوالہ بنتا ہے۔

سوال: حیدرقریشی کے فن کا منفی پہلو؟

جواب: ادبی چوروں کی چوریاں پکڑتے ہیں اور ادبی چور شرمندہ ہونے کے بجائے انہیں گالیاں دیتے ہیں۔

☆☆☆

(۲۷رنومبر۲۰۰۲ء)

کاشف الہدیٰ (امریکہ)

www.urdustan.com

سوال: حیدرقریشی سے تعلق؟

جواب: حیدرقریشی صاحب اردوستان ڈاٹ کام کے لئے کالم لکھتے ہیں اور میں اسے manage کرتا ہوں۔

سوال: حیدرقریشی کوکس حیثیت سے جانتے ہیں؟ (انشائیہ نگار، افسانہ نگار، ماہیہ نگار، نقاد، مدیر)

جواب: میں حیدرقریشی کوبحیثیت کالم نگاراور ماہیا نگار جانتا ہوں۔ کچھ کچھ ان کی شاعری سے بھی واقفیت ہے۔

سوال: حیدرقریشی سے پہلی ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟

جواب: ان سے کبھی ذاتی ملاقات کرنے کی خوش قسمتی تونہیں ہوئی، البتہ فون پر چند مرتبہ بات ہوچکی ہے۔ اورای میل کے ذریعے خط وکتابت رہتی ہے۔

سوال: پہلی ملاقات کا تاثر؟

جواب: ملاقات تو ہوئی نہیں۔

سوال: حیدرقریشی کے بارے میں عمومی رائے؟

جواب: حیدرقریشی صاحب کواپنی قوم اور ملک سے بے حد محبت ہے۔ جوبھی لکھتے ہیں، سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ بات کی تہہ تک پہنچ جانا اور پھر قاری کواپنا موقف اس طرح سمجھاتے

ہیں کہ ان سے اتفاق رائے کرنا ہی پڑتا ہے۔

سوال: حیدرقریشی کے فن پر ناقدانہ رائے؟

جواب: میں اس لائق تو ہوں نہیں کہ ان کے فن پہ اپنی رائے دے سکوں۔ بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی شاعری میں گاؤں کی سوندھی سوندھی مہک آتی ہے جو مجھے بہت اچھی لگی۔ جبکہ ہمارے بیشتر شعراء شہر کے ہوکر رہ گئے ہیں۔ گاؤں کی تازہ ہواان کی شاعری میں پا کے، لگتا ہے کہ دل نے بھی سانس لیا ہو۔ جہاں تک ان کے کالم کا سوال ہے، ان کے کالم کا نام ''منظر اور پس منظر'' ہے، اور واقعی وہ منظر کا پس منظریوں بیان کرتے ہیں کہ قاری حیران ہوجاتا ہے۔

سوال: اردو ادب میں حیدرقریشی کا مقام؟

جواب: یہ تو اردو ادیب ہی طے کر سکتے ہیں

سوال: حیدرقریشی کی شخصیت کا منفرد پہلو؟

جواب: اخلاص سے ملنا

سوال: حیدرقریشی کے فن کا منفرد پہلو؟

جواب: بہت کم ہی ادیب ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ادب کے ہر گوشے میں نمایاں کام کرتے ہوں۔ اور حیدرقریشی ایسے چند ادیبوں میں سے ہیں جو یہ کام بخوبی کررہے ہیں۔

سوال: حیدرقریشی کے فن کا منفی پہلو؟

جواب: ؟؟؟؟

☆☆☆

(۲۷رنومبر۲۰۰۲ء)

محمد آصف خواجہ

مدیر ''شاہین'' کوپن ہیگن، ڈنمارک

سوال: حیدرقریشی سے تعلق؟

جواب: ایک دوست اور ادبی فین ہونے کے ناتے

سوال: حیدرقریشی کو کس حیثیت سے جانتے ہیں؟

جواب: انشائیہ نگار، افسانہ نگار، ماہیا نگار، نقاد اور مدیر کی حیثیت سے تو بہت اچھی طرح جانتا ہوں، ماہیا نگاری میں ان کی کاوشوں اور کام کو ایک دنیا کی تائیدی سند حاصل ہے۔

سوال: حیدرقریشی سے پہلی ملاقات کب ہوئی؟

جواب: آج سے چند سال پہلے ڈنمارک سے،، شاہین انٹرنیشنل،، کی اشاعت پر میں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور مدد کی درخواست کی، انہوں نے جس ظرف، وسعت قلب، پیار اور محبت سے اس پراجیکٹ میں میری راہنمائی کی وہ صرف حیدرقریشی کا ہی کام ہوسکتا ہے۔ تعلق قربت میں اور قربت دوستی میں بدل گئی۔ اسی طرح میں نے اردو کمپیوٹر کو فرینکفرٹ میں حیدرقریشی کے توسط سے متعارف کرانے میں نمایاں رول ادا کیا۔

سوال: پہلی ملاقات کا تاثر؟

جواب: بامقصد اور بے پناہ لکھنے والا

سوال: حیدرقریشی کے بارے میں عمومی رائے؟

جواب: دوستوں کا دوست، ہر کسی کی مدد کے لئے ہر دم تیار، اردو ادب کی ترویج و ترقی میں ہر دم کوشاں، اپنے وطن، اپنی مٹی اور اپنے خاندان سے بے پناہ محبت کرنے والا۔

سوال: حیدرقریشی کے فن پر ناقدانہ رائے؟

جواب: نظم، غزل، حمد، نعت، ماہیا، افسانہ، خاکہ، انشائیہ اور تنقید، اب دیکھئے آدمی کس کس صنف پر اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کرے، اس لئے یہ کام بڑوں کے لئے چھوڑ رہا ہوں۔

سوال: اردو ادب میں حیدرقریشی کا مقام؟

جواب: پاکستان، ہندوستان کے علاوہ پوری دنیا میں حیدرقریشی کو جتنا پڑھا جاتا ہے، اسی حیثیت سے ان کے مقام کا تعین ہو جاتا ہے۔

سوال: حیدرقریشی کی شخصیت کا منفرد پہلو؟

جواب: ادب کی ہر صنف پر بے پناہ اور بامقصد لکھنے والا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آدمی سوتے میں بھی لکھتا ہے۔ میری مہمان نوازی کے دوران دن کا پورا وقت مجھے دینے کے باوجود رات کو اپنے ہاتھ سے لکھے بیس خط میرے سامنے رکھ دیئے، جو کہ پاکستان اور انڈیا کے مختلف ادیبوں اور شعراء کے نام تھے۔

سوال: حیدرقریشی کے فن کا منفرد پہلو؟

جواب: سچ، حق اور محبت

سوال: حیدرقریشی کے فن کا منفی پہلو؟

جواب: انتہائی قریب سے جاننے کے بعد منفی پہلو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

☆☆☆

(۳۰ر نومبر ۲۰۰۲ء)

حیدر قریشی کی شریک حیات

مبارکہ حیدر

سوال: حیدر قریشی کے موجود حلیے کے بارے میں رائے؟

جواب: ہاہاہا۔۔۔۔ہاہاہا۔۔۔۔

ویسے ان کی سنجیدہ تصویر ہمیشہ اچھی آتی ہے۔آپ کے سوال سے تھوڑی غیر متعلق ایک بات بتاؤں۔۔جوانی میں ان کے داڑھی تھی۔مجھے وہ داڑھی واقعی اچھی لگتی تھی۔جرمنی میں آکر انہوں نے داڑھی صاف کر دی اور کہا کہ تم نے میری داڑھی کی تعریف کر کر کے مجھے داڑھی والا بنا دیا،اور میری ساری جوانی خراب کر دی۔اب میں ان سے کہتی ہوں کہ آپ بغیر ٹوپی کے دانشور لگتے ہیں تو کہتے ہیں جوانی خراب کرنے کے بعد اب میرا بڑھاپا بھی خراب کرنا چاہتی ہو۔

سوال: لباس کیا پہنتے ہیں؟

جواب: گھر پر عموماً سلوار قمیص اور گھر سے باہر پتلون شرٹ۔ویسے ابھی حال ہی میں ایک شیروانی تیار کرائی ہے اور ایک پگڑی بھی منگا رکھی ہے۔لیکن ابھی پہنی نہیں ہے۔میرا خیال ہے اب یہ اپنے والد صاحب کے مقام پر فائز ہونے والے ہیں۔پھوپھا جان نے بھی ایک عرصہ تک

ٹوپی کے استعمال کے بعد پگڑی پہننا شروع کر دی تھی۔

سوال: خوراک کے معاملے میں کیسے ہیں؟

جواب: صابر شاکر ہیں۔جیسا بھی مل جائے،کھا پی لیتے ہیں۔کبھی کبھار ٹی وی دیکھتے ہوئے ڈرائی فروٹ کھانے میں بد پرہیزی کر جاتے ہیں۔نہاری اور پائے شوق سے کھاتے ہیں۔

سوال: حیدر قریشی کا آپ سے تعلق کیا ہے اور کیا آپ دونوں میں مکمل ہم آہنگی ہے؟

جواب: بڑا ہی جائز قسم کا تعلق ہے۔جائز تعلق میں جتنی ہم آہنگی ہو سکتی ہے وہ ہم دونوں میں ہے۔ویسے ہمارے Taste ایک دوسرے سے بالکل متصادم ہیں مگر رشتہ بہت ہی پکا ہے۔مرنے کے بعد بھی نہ ٹوٹنے والا۔

سوال: حیدر قریشی مزاجاً کیسی طبعیت کے مالک ہیں؟

جواب: بہت میٹھے اور بہت کڑوے۔اپنے ہر رویے میں انتہا پسند۔انسان کو تھوڑا بہت مصلحت پسند ہونا چاہئے۔

سوال: حیدر قریشی کا حلقہ احباب کتنا اور کیسا ہے؟

جواب: پرانا حلقہ احباب تو وہی ہے جو ابتدا میں تھا۔سعید شباب،نذر خلیق،فرحت نواز (فرحت کے ساتھ میری دوستی ان سے زیادہ ہے)۔۔۔،ادبی احباب میں ڈاکٹر وزیر آغا سے لے کر اکبر حمیدی تک ایک لمبی فہرست ہے۔اب انٹرنیٹ پر ان کے دوستوں کا ایک اور بڑا حلقہ سامنے آیا ہے۔جن میں سب سے اہم خورشید اقبال صاحب ہیں جو اردو دوست ڈاٹ کام کے مالک ہیں۔پھر امریکہ کے اردوستان والے کاشف الہدیٰ صاحب ہیں۔اور بھی بہت سے ہیں القمر والے بھی ہیں۔۔۔مگر مجھے ان ناموں کا زیادہ علم نہیں ہے۔اس کے باوجود ان کا مزاج غیر مجلسی اور تنہائی پسندی کا ہے۔

سوال: کیا آپ حیدر قریشی کی ادبی زندگی کو پسند کرتی ہیں؟

جواب: ادبی زندگی تو خیر ٹھیک ہے لیکن اب جو انہوں نے انٹرنیٹ پر ادبی کام شروع کئے ہیں۔ان سے میں بہت تنگ ہوں۔ ہر وقت کمپیوٹر میں گھسے بیٹھے ہیں۔ جاب پر جانے سے پہلے انٹرنیٹ پر ہوتے ہیں۔ جاب سے آتے ہی انٹرنیٹ پر بیٹھیں گے۔ڈاک دیکھیں گے، جواب لکھیں گے۔ پھر کھانا کھائیں گے۔کھانے کے بعد ٹی وی پر خبریں دیکھتے ہی پھر انٹرنیٹ میں چلے جائیں گے۔۔۔۔میں کمپیوٹر والے کمرے کو اپنی سوتن کا کمرہ کہتی ہوں۔

سوال: آپ کو حیدر قریشی کس حیثیت میں زیادہ پسند ہیں؟

جواب: یہ تو آج تک کبھی سوچا ہی نہیں۔دراصل میں نے انہیں خانوں میں تقسیم کر کے دیکھا ہی نہیں۔

سوال: حیدر قریشی کی ادبی زندگی کے بارے میں آپ کے تاثرات؟

جواب: میں عموماً ان کی ادبی زندگی کی مصروفیت کی وجہ سے نالاں رہتی ہوں۔ میں گھر پر ہوتی ہوں تو ان کو اپنے ادبی کاموں سے فرصت نہیں ہوتی۔ایک بار میں دو دن کے لئے اپنی بیٹی کے ہاں گئی۔واپس آئی تو کہنے لگے کہ آپ گھر پر موجود ہوں تو آپ کی موجودگی کے احساس کے باعث خود بخود ادبی کام ہوتا رہتا ہے لیکن آپ گھر پر نہیں تھیں تو کسی قسم کا کام کرنے کو جی نہیں چاہا۔یہ ان کے لئے بھی انکشاف تھا اور میرے لئے بھی۔۔لیکن یہ واقعی ایک خوشگوار حقیقت ہے۔

سوال: حیدر قریشی کو بحیثیت شوہر کیسا پایا؟

جواب: بس ٹھیک ہی ہیں۔۔۔آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے ان سوالات کے ذریعے مجھے ایک موقعہ دیا۔

☆☆☆

(۲۴؍اکتوبر۲۰۰۲ء)

اعجاز حیدر (فرانس)

سوال: حیدر قریشی سے تعلق؟

جواب:۔۔میں ان کا سب سے چھوٹا بھائی ہوں۔

سوال: لباس کیا پہنتے ہیں؟

جواب:۔۔نارمل سلوار قمیص اور باہر پینٹ شرٹ

سوال: خوراک کے معاملے میں کیسے ہیں؟

جواب:۔۔کبھی غور ہی نہیں کیا۔

سوال: کیا آپ دونوں میں مکمل ہم آہنگی ہے؟

جواب:۔۔ففٹی ففٹی

سوال: حیدر قریشی مزاجاً کیسی طبعیت کے مالک ہیں؟

جواب:۔۔آج کل میرے ساتھ کچھ گرم ہیں، ویسے ٹھیک ہی ہیں۔

سوال: حیدر قریشی کا حلقہ احباب کتنا اور کیسا ہے؟

جواب:۔۔مجھے صرف خانپور کے دوستوں کا علم ہے اور ان میں بھی فرحت نواز صاحبہ، سعید شباب صاحب اور نذر خلیق صاحب کے نام ہی مجھے یاد رہ گئے ہیں۔

سوال: کیا آپ حیدر قریشی کی ادبی زندگی کو پسند کرتے ہیں؟

جواب:۔۔میں انہیں پڑھتا رہتا ہوں۔میرا خیال ہے کہ انہیں رشتہ داروں کے بارے میں نہیں لکھنا چاہئے تھا۔باقی سب ٹھیک ہے۔

سوال: آپ کو حیدر قریشی کس حیثیت میں زیادہ پسند ہیں؟

جواب:۔۔بھائی کی حیثیت سے۔

سوال: حیدر قریشی کی ادبی زندگی کے بارے میں آپ کے تاثرات؟

جواب:۔۔یہ تو فنافی الادب ہو چکے ہیں۔اب میں اور کیا کہوں۔

سوال: حیدر قریشی کو بحیثیت بھائی کیسا پایا؟

جواب:۔۔ٹھیک ہیں۔

☆☆☆

(۲۵رنومبر۲۰۰۲ء)

رضوانہ حفیظ

سوال: حیدر قریشی سے تعلق؟

جواب: ان کی بڑی بیٹی ہوں۔

سوال: لباس کیا پہنتے ہیں؟

جواب: قمیص سلوار اور پینٹ شرٹ

سوال: خوراک کے معاملے میں کیسے ہیں؟

جواب: ہر قسم کے سالن کے ساتھ دال کی طلب کرتے ہیں۔

سوال: کیا آپ دونوں میں مکمل ہم آہنگی ہے؟

جواب: کافی حد تک۔

سوال: حیدر قریشی مزاجاً کیسی طبعیت کے مالک ہیں؟

جواب: جب غصہ آتا ہے تو کسی چھوٹی سی بات پر بھی آجاتا ہے،نہیں آتا تو بڑی بات کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ویسے عام طور پر نرم طبیعت کے ہیں۔

سوال: حیدر قریشی کا حلقہ احباب کتنا اور کیسا ہے؟

جواب: ۔عام ملنے جلنے والے تو بہت کم ہیں۔باقی کا مجھے علم نہیں۔

سوال: کیا آپ حیدر قریشی کی ادبی زندگی کو پسند کرتی ہیں؟

جواب: مجھے تو ادب سے کوئی رغبت نہیں ہے ویسے مجھے ان کی دو کتابیں ''میری

محبتیں‘‘اور’’سوئے حجاز‘‘اچھی لگی تھیں۔

سوال: آپ کو حیدر قریشی کس حیثیت میں زیادہ پسند ہیں؟

جواب: ۔والد کی حیثیت سے

سوال: حیدر قریشی کی ادبی زندگی کے بارے میں آپ کے تاثرات؟

جواب: ۔میرے خیال میں ان کا اوڑھنا بچھونا ہی ادب ہے۔باقی سب ثانوی حیثیت رکھتے ہیں لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ ان کی تحریروں میں جتنے حقیقی عزیز و اقارب ملتے ہیں اتنے آج کے کسی شاعر اور ادیب کے ہاں نہیں ملیں گے۔

سوال: حیدر قریشی کو بحیثیت والد کیسا پایا؟

جواب: بحیثیت والد نرم طبیعت کے ہیں۔اولاد پر اپنے فیصلے ٹھونستے نہیں ہیں بلکہ ان کی رائے اور مرضی پوچھتے ہیں اور اسی کو فوقیت دیتے ہیں۔البتہ جب کوئی مسئلے مسائل درپیش ہوں تو کسی سے مشورہ نہیں کرتے خود ہی حالات سے نمٹتے رہتے ہیں۔میرا خیال ہے تب بھی مشورہ کر لینا چاہئے۔

☆☆☆

(۲۴/اکتوبر۲۰۰۲ء)

شعیب حیدر

سوال: حیدر قریشی سے تعلق؟

جواب: ان کا بڑا بیٹا ہوں۔

سوال: لباس کیا پہنتے ہیں؟

جواب: نارملی پینٹ شرٹ،اور گھر میں زیادہ تر سلوار قمیص۔

سوال: خوراک کے معاملے میں کیسے ہیں؟

جواب: پاکستانی کھانے،،روٹی سالن اور کبھی کبھار بریانی۔

سوال: کیا آپ دونوں میں مکمل ہم آہنگی ہے؟

جواب: کافی حد تک

سوال: حیدر قریشی مزاجاً کیسی طبعیت کے مالک ہیں؟

جواب: پہلے تھوڑے سخت مزاج کے تھے اب قدرے نرم مزاج کے ہو گئے ہیں۔

سوال: حیدر قریشی کا حلقہ احباب کتنا اور کیسا ہے؟

جواب: کمپیوٹر اور ٹیلی فون پر کافی وسیع ہے لیکن تقریباتی اور مجالس کی سطح پر نہ ہونے کے برابر۔

سوال: کیا آپ حیدر قریشی کی ادبی زندگی کو پسند کرتے ہیں؟

جواب: مجھے ادب سے کوئی لگاؤ نہیں اس لئے کیا کہہ سکتا ہوں۔

سوال: آپ کو حیدر قریشی کس حیثیت میں زیادہ پسند ہیں؟

جواب: ۔۔باپ کی حیثیت سے

سوال: حیدر قریشی کی ادبی زندگی کے بارے میں آپ کے تاثرات؟

جواب: ۔۔ان کے بارے میں دوسرے ادیبوں کے تاثرات پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ابو کافی مشہور اور اہم ادیب ہیں۔ویسے ہاں، مجھے ان کے خاکے خاصے پسند ہیں۔کھٹی میٹھی یادیں بھی۔

سوال: حیدر قریشی کو بحیثیت والد کیسا پایا؟

جواب: پہلے کافی سخت تھے۔لیکن اب کافی نرم طبیعت کے ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

(۲۴ر اکتوبر ۲۰۰۲ء)

تسنیم حیدر/اہلیہ شعیب حیدر

سوال: حیدر قریشی سے تعلق؟

جواب: ان کی بڑی بہو ہوں۔

سوال: لباس کیا پہنتے ہیں؟

جواب: گھر میں سلوار قمیص۔گھر سے باہر پتلون اور شرٹ، کوٹ وغیرہ

سوال: خوراک کے معاملے میں کیسے ہیں؟

جواب: سالن کوئی بھی ہو ساتھ تھوڑی سی دال ضرور لیتے ہیں۔

سوال: کیا آپ دونوں میں مکمل ہم آہنگی ہے؟

جواب: ہم گھریلو مسائل سے لے کر دنیا بھر کے حالات تک آرام سے بات کر لیتے ہیں۔

سوال: حیدر قریشی مزاجاً کیسی طبعیت کے مالک ہیں؟

جواب: عام طور پر نرم ہیں مگر جب غصے میں آتے ہیں تو بہت زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔

سوال: حیدر قریشی کا حلقہ احباب کتنا اور کیسا ہے؟

جواب: کافی وسیع ہے اور دنیا بھر میں ہے۔

سوال: کیا آپ حیدر قریشی کی ادبی زندگی کو پسند کرتی ہیں؟

جواب: ادبی زندگی پوری زندگی پر حاوی ہو جائے تو مشکل ہو جاتی ہے۔کئی گھریلو تقریبات

میں ادب کی وجہ سے بہت کم وقت دے پاتے ہیں۔اول تو تقریب سے غائب رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔اگر شامل ہوں تو تب بھی جلد سے جلد گھر جانے کی کرتے ہیں۔

سوال: آپ کو حیدر قریشی کس حیثیت میں زیادہ پسند ہیں؟

جواب:۔ان کی صاف گوئی کی حیثیت مجھے پسند ہے۔کسی مسئلے،کسی معاملے پر جب بھی رائے دیں گے،صاف گوئی سے بات کریں گے۔حقیقی انداز اختیار کریں گے۔

سوال: حیدر قریشی کی ادبی زندگی کے بارے میں آپ کے تاثرات؟

جواب:۔مجھے ان کی کتاب ''میری محبتیں'' بہت پسند ہے۔

سوال: حیدر قریشی کو بحیثیت سسر کیسا پایا؟

جواب: ۔روایتی قسم کے سسر سے بالکل مختلف ہیں۔

☆☆☆

(۳؍نومبر۲۰۰۲ء)

نادیہ حیدر اہلیہ عثمان حیدر

سوال: حیدر قریشی سے تعلق؟

جواب: ان کی دوسری بہو ہوں۔میرے خالو بھی ہیں۔

سوال: لباس کیا پہنتے ہیں؟

جواب: گھر میں سلوار،قمیص اور گھر سے باہر پینٹ،کوٹ۔

سوال: خوراک کے معاملے میں کیسے ہیں؟

جواب: سب کچھ کھا لیتے ہیں،کبھی کبھی دال کی فرمائش کرتے ہیں۔

سوال: کیا آپ دونوں میں مکمل ہم آہنگی ہے؟

جواب: کوئی خاص نہیں۔

سوال: حیدر قریشی مزاجاً کیسی طبعیت کے مالک ہیں؟

جواب: جب نرم ہوتے ہیں تو بہت نرم ہوتے ہیں،ایسا لگتا نہیں کہ انہیں غصہ بھی آتا ہوگا۔مگر جب غصہ کرتے ہیں تو بہت غصہ کرتے ہیں۔

سوال: حیدر قریشی کا حلقہ احباب کتنا اور کیسا ہے؟

جواب: بہت زیادہ ہے۔مگر میں ان سے واقف نہیں ہوں

سوال: کیا آپ حیدر قریشی کی ادبی زندگی کو پسند کرتی ہیں؟

جواب: ٹھیک ہے۔

سوال: آپ کو حیدر قریشی کس حیثیت میں زیادہ پسند ہیں؟

جواب: جب سارے بچوں میں بیٹھ کر مزے کی باتیں کر رہے ہوتے ہیں تب، اور یا پھر جب کوئی عزیز رشتہ دار کسی پریشانی سے دوچار ہو اور اس کے مسئلے کا حل بتا رہے ہوں۔ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے۔ویسے مجھے عثمان کے والد کی حیثیت سے زیادہ پسند ہیں۔

سوال: حیدر قریشی کی ادبی زندگی کے بارے میں آپ کے تاثرات؟

جواب: ۔ان کی باقی ساری زندگی پر ادبی زندگی زیادہ حاوی ہے، ویسے باقی امور سے بالکل لاتعلق نہیں ہوتے۔جہاں ان کی ضرورت ہو وہاں موجود ہوتے ہیں۔

سوال: حیدر قریشی کو بحیثیت سسر کیسا پایا؟

جواب: ۔ٹھیک ہیں۔

☆☆☆

(۳رنومبر۲۰۰۲ء)

حیدر قریشی کے فن اور شخصیت کی تفہیم کے حوالے سے پانچ اہم کتب

۱۔**حیدر قریشی فکر و فن** صفحات:۱۴۴

مصنف محمد وسیم انجم (مطبوعہ ۱۹۹۹ء)

ناشر: انجم پبلشرز، کمال آباد نمبر ۳، راولپنڈی۔پاکستان

۲۔**حیدر قریشی فن اور شخصیت** صفحات: ۱۹۲

مرتبین: نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑبولے (مطبوعہ ۲۰۰۲ء)

ناشر: اسباق پبلی کیشنز۔پُونہ، انڈیا

۳۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات** صفحات:۳۰۶

مرتب: نذر خلیق (مطبوعہ ۲۰۰۳ء)

ناشر: میاں محمد بخش پبلشرز۔خانپور۔پاکستان

۴۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن** صفحات:۲۶۰

منزہ یاسمین کا ایم اے تحقیقی مقالہ اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے۔(مطبوعہ ۲۰۰۳ء)

ناشر: میاں محمد بخش پبلشرز۔خانپور

۵۔**انٹرویوز** صفحات:۱۶۰

مرتب: سعید شباب (مطبوعہ ۲۰۰۴ء)

ناشر: نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ایمسٹرڈیم۔ہالینڈ

مزید انٹرویوز

کتاب انٹرویوز۱۶۰صفحات پر مشتمل تھی۔۲۰۰۴ءکے بعد سے
۲۰۱۴ءتک حیدر قریشی سے مزید آٹھ انٹرویو کئے جا چکے ہیں۔
وہ انٹرویوز اس انٹرنیٹ ایڈیشن میں شامل کیے جا رہے ہیں۔
(سعید شباب)

سوال جو اتنے کر رہے ہو
تمہارا اصلی سوال کیا ہے
(حیدر قریشی)

عارف فرہاد کی
حیدر قریشی سے گفتگو

حیدر قریشی کی ہمہ جہت شخصیت ادبی دنیا میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔اخبارات اور جرائد کے لئے اب تک اُن کے کئی انٹرویوز لئے جا چکے ہیں مگر اِن میں سے بیشتر آن لائن یا بذریعہ ڈاک منگوائے گئے۔گزشتہ دنوں مجھے یورپ کے دورے میں ان سے تفصیلی ملاقاتوں کا موقع ملا تو میں نے ''فورم انٹرنیشنل'' کے لئے ان کا خصوصی انٹرویو لیا۔ان کے ادبی کام کے تو ہم سب پہلے سے ہی معترف تھے مگر جرمنی میں ان سے بالمشافہ ملاقاتوں سے اس بات کا بھی احساس ہوا کہ حیدر قریشی نہ صرف اپنی تخلیقات کی طرح سچے، کھرے اور متوازن ہیں بلکہ ایک خوش مزاج، نفیس اور شائستہ آدمی ہیں۔

عارف فرہاد: برادرم حیدر قریشی صاحب، ہمیں کچھ اپنے ابتدائی حالات کے بارے میں بتائیے؟

حیدر قریشی : عارف فرہاد صاحب! میری زندگی کا آغاز رحیم یار خان سے ہوا تھا اور بچپن کا آدھا حصہ وہاں گذارا، اس کے بعد ہم لوگ خانپور شفٹ ہوگئے اور خانپور میں ہی زندگی کا باقی حصہ گذارا۔کہیں نہ کہیں چھوٹے چھوٹے پڑاؤ رہے مگر زیادہ تر خانپور، رحیم یار خان کو ہی شمار کرتا ہوں اور اس کے بعد سے اب تک جرمنی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

عارف فرہاد : یہ بتائیے کہ آپ قریشی غلام حیدر ارشد سے حیدر قریشی کیسے بنے؟

حیدر قریشی : یہ کچھ یوں ہوا کہ ہماری ایک عزیزہ تھیں، بزرگ خاتون۔انہوں نے بڑے

پیار سے میرے نام کے ساتھ ارشد کا اضافہ کر دیا۔بچپن میں ہی، تو ان کے احترام میں ارشد کا تخلص تو رہنے دیا مگر جب لکھنے کا شوق ہوا تو مجھے لگا کہ یہ نام ادبی طور پر کچھ میچ نہیں کر رہا تو میں نے سوچا کہ مجھے کس طرح کا نام اختیار کرنا چاہئے تو پھر حیدر قریشی مجھے مناسب لگا اور میں نے حیدر قریشی نام اختیار کر لیا۔

عارف فرہاد: جرمنی آنے کا خیال کیسے آیا آپ کو؟

حیدر قریشی : آہ۔یہ لمبی کہانی ہے اور اس کے لئے ابھی مزید چھ مہینے انتظار کریں۔اس کے بعد میں جو کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔

عارف فرہاد: تو اب تک آپ نے جو انٹرویوز دیئے ہیں ان میں جرمنی آنے کا واقع سچ تھا یا جھوٹ تھا۔

حیدر قریشی : نہیں جھوٹ کہیں نہیں بولا ہے۔یہ تو ہوسکتا ہے کہ کہیں کسی مجبوری یا مصلحت کے تحت خاموشی اختیار کر لی ہو لیکن جھوٹ کہیں نہیں بولا اور ابھی میں ان باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا اور جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہتا بلکہ بعد میں دیانتداری سے بتاؤں گا کہ کیا صورت حال تھی اور کیا Situation تھی۔

عارف فرہاد : یہاں آکر بھی لکھنا لکھانا جاری رکھا، یہ بتائیے کہ یہاں آکر آپ کے انداز فکر میں کوئی تبدیلی آئی اور اگر آئی تو اس کی وجہ کیا تھی۔

حیدر قریشی: دیکھیں جی وہ جو کہتے ہیں نا کہ سفر وسیلہء ظفر ہے تو ظاہر ہے کہ پاکستان جیسے معاشرے سے نکل کر یورپ کے معاشرے میں آنا اور اس میں بھی پھر جرمنی جیسے ملک میں آنا تو ذہنی کشادگی کا ایک احساس ہوا ہے۔بہت سی چیزیں ہیں جو وہاں کے ماحول میں بیٹھ کر کچھ اور طرح دکھائی دیتی تھیں۔یہاں آکر ان میں تھوڑا فرق محسوس ہوا ہے۔Vision میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلی آئی ہے لیکن یہ نہیں کہ میں اپنی جڑوں سے کٹ گیا ہوں۔میری بنیاد وہی ہے۔اس بنیاد پر رہتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ میری سوچ میں کچھ وسعت آئی ہے، ذہنی کشادگی ہوئی ہے اور دونوں کا کمبی نیشن آپ میرے ہاں دیکھ سکتے ہیں۔

عارف فرہاد : اس سے پہلے بہت سے احباب آپ سے پوچھ چکے ہیں، آپ نے پہلے شاعری کی یا نثر لکھی، میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ جرمنی آ کر آپ نے پہلی غزل، پہلا افسانہ یا پہلا تحقیقی یا تنقیدی کام جو کیا اس کی تفصیل کیا ہے۔

حیدر قریشی: یہ حساب کتاب والی بات تو بالکل اب ذہن میں نہیں ہے لیکن یادداشت کے سہارے جو کچھ فوری طور پر ذہن میں آ رہا ہے پھر وہی بات آ جاتی ہے کہ یادوں کے ساتھ یا اپنی روایت کے ساتھ جڑنے کی چیز جو تھی وہ بڑی شدت کے ساتھ یہاں آ کر ظاہر ہوئی مثلاً ماہیے پر میرا جو بنیادی کام ہے وہ یہاں آ کر شروع ہوا۔ اس کو صرف ماہیے والی بحث نہ سمجھیں۔ ماہیے کی بحث کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ ماہیا میرے Locale سے Related چیز ہے یعنی ایک زاویئے سے اس مٹی سے جڑنے کا عمل بھی تھا جہاں میں نے زندگی بسر کی۔ گویا اپنے ماضی یا اپنی روایت کے ساتھ جڑے رہنے کی کیفیت یا خواہش یا جو بھی اس کو آپ کہہ لیں، تو یہ سب از خود آتا چلا گیا، شاعری میں بھی، دوسری تحریروں میں بھی۔۔ پہلا افسانہ مجھے یاد ہے، میں نے ''مسکراہٹ کا عکس'' لکھا تھا۔ یہ وہ افسانہ ہے جس میں میری خاکہ نگاری اور افسانہ نگاری ایک دوسرے میں ضم ہوگئی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار میرے والد صاحب ہیں۔ ''اوراق'' میں چھپا تھا یہ افسانہ اور آغا جی نے بہت پسند کیا تھا اسے۔ اس کے باقی کے کردار جو میرے تینوں بیٹے ہیں اور میں۔ یعنی یہ وہ افسانہ ہے جو یہاں آنے کے بعد مجھ سے لکھا گیا۔ اس میں بھی اپنی مقامیت کے ساتھ وابستہ رہنے کی ایک خواہش تھی۔

عارف فرہاد : احمد ندیم قاسمی اور آغا صاحب، دو ادبی ستون ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے قاسمی صاحب کی پہچان ان کا افسانہ اور ان کی شاعری ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ ان کی کالم نگاری ہے۔ اسی طرح آغا صاحب کے حوالے سے بھی کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی پہچان تنقید ہے۔ کچھ کے خیال میں نظم ہے اور کچھ کے نزدیک ان کی انشائیہ نگاری۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ان دونوں شخصیات کے کس کس کام کو ہم اہمیت دے سکتے ہیں اور ان کی شناخت ٹھہرا سکتے ہیں۔

حیدر قریشی: میرے نزدیک دونوں بزرگوں کے ٹوٹل کام کی بنیاد پر ہی ان کا مجموعی

Impact بنے گا۔ ان کو خانوں میں تقسیم کر کے یعنی احمد ندیم قاسمی کی غزل کو ان کے افسانے سے لڑا کے یا آغا جی کی نظم کو ان کی تنقید سے لڑا کے تو وہ آغا جی Verses آغا جی اور قاسمی جی Verses قاسمی جی تو یہ بات نہیں بنے گی۔ ان کے ٹوٹل ورک سے ہی ان کا ٹوٹل Impact بنے گا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی کسی صنف یا تحریر میں اس قدر مضبوط ہوں کہ دوسری صنف نسبتاً کچھ کم لگے لیکن جو بڑے Artist ہوتے ہیں۔ ان کی کمزور تحریر کا بھی کم از کم کوئی Level ہوتا ہے۔ اس لئے وہ کم از کم Level جو ہے وہ بہت سوں کے بڑے لیول سے بھی زیادہ ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ کسی ایک حوالے سے ان کی پہچان مقرر کی جائے۔ ہاں آغا جی کے حوالے سے میں یہ کہنا پسند کروں گا کہ ان کا اکیڈمک لیول اتنا ہائی ہے کہ ان کو تو ابھی تک پاکستان میں صحیح طرح سے سمجھا ہی نہیں گیا اور یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہمارے ہاں جو جرنلسٹک ٹائپ کا ادب ہے۔ یہاں میں جرنلزم کے خلاف نہیں بول رہا ہوں۔ جرنلزم کی اپنی ایک اہمیت ہے، افادیت ہے اور اس کا میں بڑا معترف ہوں بلکہ اس سے فیض یاب ہوتا رہتا ہوں لیکن وہ جو ادب میں جرنلسٹک Value کو جس طرح سے لایا گیا ہے اس طرح کے لوگوں نے بھی کچھ خرابی کی ہے۔ آغا جی کی تفہیم ہونے میں۔

عارف فرہاد : یہاں آ کر آپ نے ماہیے پر پہلی مرتبہ تحقیقی وتنقیدی کام کیا۔ نہ صرف خود لکھا بلکہ دوسروں کو بھی تحریک دیتے رہے۔ یوں ماہیا آپ کی شناخت بن چکا ہے۔ یہ بتائے کہ آپ نے خود ماہیے کب لکھنا شروع کئے؟

حیدر قریشی: اب مجھے صحیح طرح سے یاد نہیں، ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی کتاب یا ریفرنس دیکھنا پڑے گا۔ وہ کون سے دوست تھے جو آپ کے ہم نام بھی تھے ذرا سے۔ ہاں یاد آیا۔ ممتاز عارف۔ انہوں نے اوراق میں ایک خط لکھا تھا اور میرا خیال ہے یہ 1990ء کا کوئی شمارہ تھا جس میں انہوں نے ماہیے کے وزن کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس کے فوراً بعد اور اوراق کا اگلا شمارہ آنے سے پہلے میں نے نہ صرف ماہیے لکھے بلکہ ان کے Favour میں ایک خط لکھا اور سب سے پہلے میرے ماہیے ادب لطیف لاہور میں چھپے تھے۔ ادب لطیف کا غالباً 55 سالہ نمبر تھا یا گولڈن

جوبلی نمبر،نومبر کا شمارہ تھا شاید۔اس کے بعد اوراق اور دیگر رسائل میں میرے ماہیے چھپے یعنی جس سال ممتاز عارف صاحب کا خط اوراق میں چھپا،اسی سال میں نے ماہیے لکھے۔

عارف فرہاد : آپ نے نظم بھی لکھی، افسانہ بھی، انشائیہ بھی لیکن اصلاً آپ نے جو تحقیقی و تنقیدی کام کیا وہ ماہیے پر ہے۔آپ نے غزل یا نظم پر کیوں نہیں کیا؟

حیدر قریشی: بات یہ ہے کہ میں ماہیے پر اتنا کام کرنا نہیں چاہ رہا تھا، وہ تو مجھے یار لوگوں نے دھکیلا اس طرف۔ آپ نے لطیفہ سنا ہوگا نا کہ کسی ڈوبتے ہوئے کو بچانے کے لئے ایک صاحب چلے گئے تو جب بچا کر واپس لے آئے تو لوگوں نے انہیں بڑی داد دی تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ داد واد بعد میں دیں پہلے یہ بتائیں کہ مجھے دھکا کس نے دیا تھا۔تو مجھے تو دھکا دیا گیا ہے۔ایک بڑی سادہ سی اور بڑی صاف سی بات تھی اور میرا خیال تھا سب دوست فوراً بات مان لیں گے کہ بھئی ماہیے کا یہ مسئلہ ہے، یہ پنجابی میں یوں ہے۔اس کو ذرا گنگناؤ تو یہ ماہیا ہے اور یہ سب کو سمجھ آجائے گی۔اس سے کوئی جھگڑا کھڑا نہیں ہوگا مگر لوگوں نے اتنا جھگڑا کھڑا کر دیا اور اس پر اتنی بحث چلی کہ مجبوراً مجھے اس میں Involve ہونا پڑا اور اس طرح سے یہ کام ہوتا چلا گیا لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شعبے میں کام کرنے کی اگر آپ کو توفیق ملی ہے تو یہ خدا کا فضل ہے اور وہ جس طرح سے بھی توفیق دے اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔کسی اور صنف میں مجھے کام کرنے کی توفیق مل جاتی تو وہ بھی اس کی مہربانی ہوتی۔اس میں (ماہیے میں) کام کرنے کا موقع مل گیا تو اسے میں اپنی کوئی کمزوری نہیں سمجھتا ہوں۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب، آپ کی ادب میں جو Contribution ہے اس میں ایک حوالہ آپ کے ادبی جریدے جدید ادب کا بھی آجاتا ہے۔ یہ بتائیے کہ جدید ادب کا آغاز آپ نے کب کیا تھا۔

حیدر قریشی: ہاں یہ میں نے اکتوبر 1978ء میں اس کا پہلا شمارہ شائع کیا تھا جس میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی تصویر میں نے ٹائٹل پر دی تھی اور بڑا ہی غریبوال سے ہمارا یہ پرچہ تھا، 80 صفحات کا، ایک سال تک ہم کتابی سلسلے کی صورت میں 80 صفحات کا ہی پرچہ نکالتے رہے۔

پھر کچھ تھوڑی سی Development ہوئی۔خانپور کے دوستوں نے دیکھا کہ کچھ کام ہو رہا ہے تو انہوں نے ساتھ دینا شروع کیا، پھر اسے ہم نے کچھ ضخیم بھی کیا۔500 صفحات تک بھی لے گئے۔ گویا یہ خانپور کا دور جو تھا یہ آٹھ یا نو سالوں کا تھا۔

عارف فرہاد : اچھا یہ بتایئے کہ خانپور کا جو دور تھا اس زمانے میں وہاں کی ادبی فضا یا یہ کہہ لیجئے کہ ان دنوں آپ کا کن کن پاکستانی ادیب شاعروں سے رابطہ رہا۔

حیدر قریشی: خانپور کے جتنے بھی مقامی دوست تھے، سب سے ہی رابطہ رہا۔ سارے شروع میں بڑے خوش ہوئے اور پھر اس کے بعد ساروں کو ایسا لگا کہ شاید ہماری وجہ سے یہ آگے بڑھ رہا ہے جو اکثر ہوتا ہے اور جب میں نے خانپور چھوڑ دیا اس کے بعد سارے ٹھنڈے ہو گئے۔ اب اتنے سال گذر گئے ان میں سے کسی کو بھی کوئی بے چینی نہیں ہے۔اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے

عارف فرہاد : جدید ادب کا سلسلہ پھر کب منقطع ہوا اور کب دوبارہ آپ نے اس کا اجراء کیا۔اس کی بھی ذرا سی تفصیل بتا دیجئے۔

حیدر قریشی: میرا خیال ہے 1987ء میں اس کا آخری پرچہ میں نے پاکستان سے شائع کیا تھا جو سات ادیبوں کا گوشہ تھا۔ایک جوگندر پال نمبر بھی چھاپا تھا ایک سات ادیب نمبر۔ یہ غالباً 87ء میں ہی آخری شمارہ تھا۔اس کے بعد پھر خانپور میں جو میرے حالات تھے وہ ایسے نہ رہے کہ میں جدید ادب جاری رکھ سکتا۔اصل میں اپنی بیوی کے زیور کے بل پر میں نے یہ رسالہ جاری رکھا ہوا تھا، جب وہ زیور بالکل ختم ہو گیا تو رسالہ بالکل بند ہو گیا۔ پھر اس دوران مجھے خانپور بھی چھوڑنا پڑا اور گوجرانوالہ سے لے کر ایبٹ آباد تک کئی مقامات سے گذرتا ہوا میں جرمنی آ گیا۔ جب جرمنی پہنچا ہوں تو یہاں آنے کے بعد خواہش تھی کہ پرچہ نکالا جائے۔شروع میں جب اس کے دو شمارے نکالے تو میں نے دیکھا کہ ان میں میری اپنی بطور ایڈیٹر Involvement نہیں ہے اور جو مقامی دوست جن کے سپرد وہ کام کیا تھا ان کا اپنا دخل اس میں زیادہ آ گیا ہے۔ میرے نزدیک پرچے کا تشخص شروع سے جو رہا ہے کہ اس میں ایڈیٹر نظر آئے وہ ان دونوں پرچوں میں نہیں تھا۔

لہذا پھر میں نے بند کر دیا۔اب انٹرنیٹ کی جو سہولت میسر آ گئی ہے اس سے رابطے سیدھے ہو گئے ہیں اور مجھے اس سے کچھ فیضیاب ہونے کا موقع بھی ملا ہے، تین شمارے اب تک نکال چکا ہوں۔ انشاءاللہ چوتھا شمارہ آخری مرحلے میں ہے۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب آپ نے افسانے بھی لکھے۔ معاصرین افسانہ نگاروں پر آپ کی نظر بھی رہی۔ آپ کے نزدیک اردو افسانے نے کوئی ترقی بھی کی اور اس میں کوئی پیشرفت بھی ہوئی اور کس حوالے سے ہوئی۔

حیدر قریشی: جدید افسانے کے حوالے سے اردو میں بہت ترقی ہوئی۔ جدید افسانہ، حقیقتاً اردو کا افسانہ، مغرب کے افسانوں سے بھی نسبتاً بہتر لکھا جا رہا ہے۔

عارف فرہاد : آپ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیے کی روایت ڈالی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ انہوں نے انشائیے کو اردو ادب میں متعارف کروایا۔ آپ نے خود بھی انشائیے لکھے۔ یہ بتائیے کہ نئے لکھنے والوں کے لئے اگر وہ انشائیہ لکھنا چاہتا ہے تو اس کی تفہیم کیلئے آپ انشائیہ کی کیا تعریف بیان کریں گے کہ انشائیہ ہے کیا؟

حیدر قریشی :اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب مزید کیا کہا جائے کیونکہ کوئی گائیڈ لائن دینے والی بات تو نہیں ہے۔Basically تو یہ ہے کہ ایک موضوع آپ کے ذہن میں آتا ہے تو اس کے مختلف پہلوؤں کو آپ اس زاویئے سے دیکھیں کہ اس کے مخصوص مدار سے آپ باہر نکلیں، پھر دیکھئے، آپ پر کیا کیا نئی چیزیں منکشف ہوتی ہیں۔ٹوپی ہے، کرسی یا گری پڑی چیزیں ہیں جن کو بڑے دانشور اہمیت ہی نہیں دیتے کہ اس پر کیا لکھنا ہے۔انشائیہ نگار کا کمال یہ ہے کہ اس طرح کی عام سی چیزوں کی غیر معمولی خوبیاں اس پر منکشف ہوتی ہیں اور پھر وہ ان کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔

عارف فرہاد : حیدر قریشی صاحب ہم چاہیں گے کہ کچھ آپ اپنی زبانی ماہیے پر اب تک ہونے والے کام کی تفصیل ہمارے قارئین کو بتائیے۔

حیدر قریشی : ماہیے پر کام تو بہت ہوا ہے اور زبانی انٹرویوز میں اتنا سارا حساب بیان کرنا تو

بہت مشکل ہے مگر جو مین کام ہے اس میں کوئی 40 سے اوپر تو ماہیے کے مجموعے چھپ چکے ہیں اور تنقیدی حوالے سے تین کتابیں تو میری آ چکی ہیں۔ ایک آپ کی جو میں سمجھتا ہوں کہ ماہیے کی ساری بحث کا احاطہ کرتی ہے۔ یعنی 1990ء سے لے کر اب تک پوری بحث کا خلاصہ اور احاطہ کرتی ہے۔ ''ماہیے کے خدوخال'' اس کے علاوہ کچھا کا دکا کتابوں میں ماہیے کے لئے کچھ سیکشن آئے ہیں مثلاً عروض کی ایک کتاب چھپی ہے اب مجھے نام بھول رہا ہے، شاید ڈاکٹر عارف حسن ہیں یا کوئی اور دوست ہیں۔ اس میں انہوں نے باقاعدہ ایک چیپٹر رکھا ہے، ماہیے کی عروض پر اس طرح کچھ اور بھی کتابیں آئی ہیں جن میں ماہیے پر قابل قدر چیزیں ہیں پھر ہندوستان سے ایک صاحب ہیں غالباً مشتاق اعظمی نام ہے ان کا۔ انہوں نے ماہیے پر PHD کی اور انہیں PHD کی ڈگری مل چکی ہے۔ وہ مقالہ میں نے نہیں دیکھا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا معیار کس لیول کا ہے اور وہاں کے لوگ ماہیے کو جس حد تک سمجھ سکے ہیں اس حد تک ہی انہوں نے بیان کیا ہوگا لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ پاکستان سے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے ابھی ایک بچی شگفتہ الطاف PHD کرنے جا رہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ PHD کے حوالے سے ان کا مقالہ زیادہ اہمیت کا حامل ہوگا کیونکہ یہاں کے سارے لوگ جو ہیں وہ ماہیے سے Related ہیں اور ماہیے کو سمجھنے والے لوگ زیادہ بہتر سمجھنے والے لوگ ہیں۔

عارف فرہاد : تخلیقی اعتبار سے آپ کے نزدیک اہم ماہیا نگار کون کون سے ہیں۔

حیدر قریشی : چونکہ یہ بالکل ابتدائی دور ہے، ماہیے کا تو میرے نزدیک ہر ماہیا نگار ہی میرے نزدیک اہم ہے۔ یہاں تک کہ جس نے دو چار ماہیے بھی کہہ دیئے ہیں تو میں اسے بھی اہم سمجھتا ہوں لیکن پھر بھی جن کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ ماہیے کو آگے بڑھنے کا موقع مل رہا ہے تو ابتدائی دور میں ہمت رائے شرما ہیں۔قمر جلال آبادی ہو گئے، ساحر لدھیانوی ہو گئے اور قتیل شفائی اور اس موجودہ دور میں جو لکھنے والے ہیں ان میں نذیر فتح پوری ہیں، آپ خود عارف فرہاد ہیں، ترنم ریاض، شاہدہ ناز، ثریا شہاب ہیں گو ثریا نے بہت کم ماہیے کہے ہیں لیکن جتنے کہے ہیں بہت اچھے کہے ہیں۔سعید شباب ہیں، قمر ساحری مرحوم ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، ان کا تو

ماہیے کا دیوان ہے جو ایک ہسٹری ہے کہ ماہیے کا دیوان ابھی تک کسی نے نہیں لکھا۔ حروفِ تہجی کے لحاظ سے انہوں نے پورا اس کا التزام رکھا ہے۔ امین خیال بھی ہیں، بڑے اہم نام ہیں جو میں بھول رہا ہوں، تو یہ بات مشکل ہے، میرے لئے میں معذرت چاہوں گا کہ بڑے پیارے پیارے دوست میں بھول رہا ہوں۔ ناصر نظامی صاحب ہیں ان کا اتنا ضخیم ماہیے کا مجموعہ ہے ''یادوں کی بارش'' اور بھی بہت سے ہیں۔

عارف فرہاد : یورپ کی ادبی فضا کیسی ہے اور کیا آپ کے نزدیک یہاں مقیم ادیبوں اور شاعروں میں سے کسی کی اہمیت بنتی ہے، اردو ادب میں۔

حیدر قریشی : اس سوال کو آپ دو حصوں میں بانٹیں، ایک تو یہ کہ یورپ میں جو لکھنے والے ہیں ان میں سارے ہی لکھنے والے وہ ہیں جو پاکستان سے ہی لکھتے ہوئے آئے ہیں اور اسی حوالے سے ان کی شناخت بنتی ہے جو Prominent ادیب ہیں ان کی شناخت اس لئے نہیں کہ وہ یہاں رہتے ہیں اور یورپ میں رہتے ہوئے وہ اچھے شاعر ہیں بلکہ یہ کہ وہ اردو کی مین سٹریم کے اچھے شاعر ہیں، کوٹہ سسٹم کے تحت اچھے شاعر نہیں ہیں۔ ان میں آپ ساقی فارقی لے لیں۔ اکبر حیدرآبادی لے لیں۔ افسانے میں ہرچرن چاولہ، جیتندر بلو، افضل عباس ایک اچھے شاعر ہیں، ناروے میں۔ اسی طرح اور بھی کچھ نام ہیں۔ تو یہ وہ لوگ ہیں جو Genuine لکھنے والے ہیں۔ اوریجنل لکھنے والے ہیں اور پاکستان سے ہی ان کی شناخت تھی، یہ تو ہوا سوال کا ایک حوالہ، دوسرا حوالہ یہ بنتا ہے کہ یہاں یورپ میں رہتے ہوئے یہاں کی نئی نسل میں سے کوئی بھی شاعر اور ادیب اردو کا نہیں بنا ہے جو کہ ایک المیہ ہے ہمارے لئے۔ اور اس سے ہمیں یہ اندازہ کرنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے کہ یہاں رہتے ہوئے اردو کے فروغ کی صورت نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ہم میلے ٹھیلے کی فضا بنالیں، رونق میلہ لگالیں، ثقافتی شو کرلیں، وہاں تک ٹھیک ہے لیکن ادبی حوالے سے میں نہیں سمجھتا کہ یہاں کوئی ایسا قابلِ ذکر کام ہے۔

عارف فرہاد : ایک جگہ میں نے پڑھا کہ پروفیسر چشتی نے علامہ اقبال کی ایک کوشش دی تھی کہ ہمیں چاہئے کہ ہم ادب اور علم کو مسلمان کریں تو اس پس منظر میں آپ کیا جانتے ہیں کہ کیا

ادب اور مذہب کا ایک دوسرے پر انحصار ہے اور کس حد تک ہے۔

حیدر قریشی : مسلمان کرنے والی بات کا تو مجھے علم نہیں ہے چونکہ میرے علم میں نہیں اس لئے میں اس حوالے سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ اپنے اپنے Concept کی بات ہے ایک Concept یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان کرنے کی بھی ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر دیکھا جائے تو لیکن وہ ایک دوسرا Topic ہو جاتا ہے جو مذہب اور ادب کے تعلق کا سوال ہے تو بالکل تعلق ہے اور صرف مذہب اور ادب ہی نہیں، سائنس کو بھی اس میں شامل کرلیں۔ سائنس، مذہب اور ادب ان تینوں کی جستجو کا رخ خالق کائنات کی طرف ہے۔ رستے الگ الگ ہیں تینوں کے۔ مذہب، روحانیت کے حوالے سے خدا کی جستجو کرتا ہے۔ سائنس عقل کے حوالے سے اپنے ٹھوس حقائق کی بنیاد پر۔ لیکن سفر اُسی کی طرف کر رہی ہے۔ اُس کا انکار کرتے ہوئے جا اُسی کی طرف رہی ہے۔ اور ادب جمالیاتی حوالے سے اُسی کی طرف جا رہا ہے لہٰذا ان تینوں کی جستجو کا رخ ایک ہی طرف ہے۔ چونکہ رخ ایک ہے اس لئے تینوں ایک دوسرے سے تعلق تو رکھتے ہیں۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب، آپ نے سوئے حجاز، سفرنامہ بھی لکھا، عمرے کی سعادت بھی حاصل کی۔ حجاز کی مقدس زمین سے ہو کر آئے، جیسا کہ ابھی ہم اس حوالے سے بات کر رہے تھے کہ سائنس، مذہب اور ادب کا آپس میں تعلق ہے اور ان کا رخ اپنے خالق کی طرف ہے تو آپ وہاں سے ہو کر آئے۔ کیا اس سعادت سے فیض یاب ہونے کے بعد آپ کے ادب یا آپ کے فکری زاویئے میں بھی کوئی تبدیلی آئی۔

حیدر قریشی : میرا خیال ہے کہ کچھ تبدیلی آئی ہے اور وہ میرے سفرنامہ میں خاص طور پر دیکھی جاسکتی ہے اور اس کے پیش لفظ میں میں نے لکھا بھی ہے کہ اس سفر کے دوران کہیں میرے خیالات میں مزید پختگی آئی ہے اور کہیں بہتر تبدیلی آئی ہے۔ لیکن یہ کہ ان کو Sort Out کرنا اور ان کی چھان پھٹک کر کے کچھ کہنا تو بڑا مشکل ہے کہ خاص طور پر کوئی بات Point Out کی جائے۔ یہ کام میرا خیال ہے نقاد کا ہونا چاہئے وہ دیکھے کہ بھئی اس سفر کے بعد اس کے ہاں کیا تبدیلی آئی ہے۔

عارف فرہاد : ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں اقبال چیئر پر اب تک کچھ دوست پاکستان سے حکومت کی طرف سے آئے۔ آپ کا خیال ہے کہ ان لوگوں نے اس چیئر پر آ کے اردو کے لئے کوئی کام کیا یا محض حاضریاں لگا کر جاتے رہے۔

حیدر قریشی : اس شعبے کی کارکردگی کا مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ میرا رابطہ صرف ڈاکٹر کرسٹینا تک رہا۔ وہ بھی جس حد تک ہمارا کام ہوتا تھا کبھی کوئی وہاں فنکشن کیا تو اس کے لئے کچھ کر دیا یا جدید ادب کے ایک دور میں وہ ساتھ رہیں۔ بس اس حد تک ہمارا رابطہ رہا۔ اقبال چیئر کے تو کسی دوست سے ملاقات ہی نہیں ہوئی یہاں تک کہ اپنے پروفیسر فتح محمد ملک صاحب سے بھی ماریشس میں ملاقات ہوئی۔ یہاں جرمنی میں رہتے ہوئے ملاقات نہیں ہوئی۔

عارف فرہاد : اب ذرا نثری نظم کی طرف آتے ہیں کہ کیا آپ اسے شاعری سمجھتے ہیں۔

حیدر قریشی : اصل میں یہ بحث اتنی ہو چکی ہے کہ اب اس پر کیا کہا جائے۔

عارف فرہاد : آپ کا اپنا View کیا ہے؟

حیدر قریشی : میرا View یہی ہے کہ نثری نظم میں شعری مواد ہوتا ہے لیکن یہ شاعری نہیں ہوتی۔

عارف فرہاد : یعنی آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی Diction Poetic ہے

حیدر قریشی : نہیں میں اس کو مزید واضح کر دیتا ہوں، پہلے بھی اس کی ایک مثال دی تھی، اب میں مزید واضح کر دیتا ہوں۔ تاج محل میں جتنا میٹیریل صرف ہوا ہے اس سارے کا اگر ڈھیر لگا دیا جائے تو وہ شعری مواد ہے۔ یہ سارا میٹیریل ہے اس میں یہ چیز استعمال ہوئی اس میں وہ چیز استعمال ہوئی ہے، یہ سنگ مرمر ہے، یہ گارا ہے، یہ مٹی ہے، یہ ساری چیزیں جو ہیں ان کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ الگ الگ ڈھیریاں لگی ہوئی ہیں اور یہ شعری مواد ہے۔ جب اس مواد کو فنکارانہ طور پر استعمال کرتے ہوئے آپ نے تاج محل تعمیر کر دیا تو وہ ایک شاندار نظم بن گئی ہے تو نثری نظم شعری مواد ہے صرف میٹیریل کا ایک ڈھیر ہے۔ شاعری نہیں ہے۔

عارف فرہاد : یعنی ضرورت ہے کہ اسے شاعری میں تبدیل کیا جائے۔

حیدر قریشی : مطلب وہ ان کی مرضی ہے، وہ چاہیں تو ویسے ہی رہنے دیں۔۔۔

عارف فرہاد : بہت خوب! یہ بتائیے کہ اگر ہم ہندوستانی اور پاکستانی شعری ادب کا موازنہ کریں تو آپ کو کس کا پلڑا بھاری دکھائی دیتا ہے اور اس کی وجہ کیا ہے۔

حیدر قریشی : میرا خیال ہے پلڑا بھاری والی بات نہیں ہے کیونکہ پاکستان میں اس پر زیادہ کام ہوا ہے۔ تھوڑا سا پاکستان کا پلڑا بھاری لگتا ہے لیکن اٹھارہ، بیس کا فرق ہے، کوئی زیادہ فرق نہیں ہے، آپ اٹھارہ ہندوستان کو نمبر دے دیں اگر تو 20 پاکستان کو دے دیں۔

عارف فرہاد: یعنی برابر ہے

حیدر قریشی : جی ہاں

عارف فرہاد : آپ کی اپنی تصنیفات اور جو آپ کی مرتب کردہ کتب ہیں ان کی تفصیل بتائیے۔

حیدر قریشی : بھائی اب زبانی تو میں یہ نہیں بتا سکتا، شاعری کے چار مجموعے چھپ چکے ہیں اور چاروں کی کلیات چھپ چکی ہیں۔ اب پانچویں مجموعے سمیت کلیات کا دوسرا ایڈیشن آ رہا ہے۔ اسی طرح افسانوں کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں اور ابھی چند دن پہلے ڈاکٹر رشید امجد بات کر رہے تھے تو کہنے لگے کہ بھئی تم تو اصل بندے ہی افسانے کے ہو۔ تم افسانہ لکھو اور جو افسانہ لکھو مجھے بھیجو۔ میں اس کا مطالعہ کر کے اس پر آرٹیکل لکھوں گا۔ دراصل وہ مجھے ایک طرح سے تحریک دینا چاہتے تھے کہ میں افسانے کی طرف مزید سنجیدگی اختیار کروں۔

عارف فرہاد : کیونکہ وہ خود افسانہ لکھتے ہیں۔

حیدر قریشی : ہاں یہ بہت کم ہوتا ہے، عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جو افسانہ نگار ہوتا ہے وہ آپ کی شاعری کی تعریف کرتا ہے اور جو شاعر ہوتا ہے وہ آپ کے افسانوں کی تعریف کرتا ہے۔ وہ افسانہ نگار ہیں اور وہ میرے افسانوں کی ہی تعریف کر رہے تھے۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب! آپ اس وقت Internet پر بیٹھے ہیں اور بہت سی اردو ویب سائیٹس پر کام بھی کر رہے ہیں۔ آپ کی تخلیقات بھی ہم Net پر دیکھتے رہتے ہیں۔ ”اردو

رائٹرز فورم“ بھی ہے۔ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے ہماری نئی نسل کتاب سے دور ہوگئی ہے، کیا اسے کتاب کی طرف لانے کیلئے کوئی حکمت استعمال کی جاسکتی ہے۔

حیدر قریشی : جو انٹرنیٹ پر اردو کی ویب سائیٹس کا مسئلہ ہے ان کی وجہ سے تو لوگ کتاب سے دور نہیں ہو رہے، کچھ اور مسائل کی وجہ سے کتاب سے ضرور دور ہوئے ہیں۔انٹرنیٹ پر تو میں سمجھتا ہوں اردو کا آنا، اردو کتابوں کا آنا، اردو ادب کا آنا بڑا بابرکت اور بڑا مفید ہے اور اچھا ہے اس سے اردو کے مستقبل پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا لیکن اردو کتاب واقعی زد میں آئی ہوئی ہے۔وہ کس چیز کی زد میں آئی ہوئی ہے۔یہ جو نئے چینل آرہے ہیں اور دلچسپی کے نئے جو سامان آرہے ہیں اس کے نتیجے میں لوگ ادب سے بالکل الگ تھلگ ہوئے جارہے ہیں اور یہاں تک کہ آپ کو نئے چینلز پہ کہیں کوئی سنجیدہ ادبی پروگرام آدھے گھنٹے کا بھی دکھائی نہیں دے گا اور اگر کہیں کوئی غیر سنجیدہ سے پروگرام بھی ہوں گے تو ان میں بھی تمسخرانہ انداز زیادہ ہوگا، ادب کے تعلق سے۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب! ادب تو ایک طرف، میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ بیرون ملک پاکستانیوں کی جو نئی نسل ہے وہ اردو زبان سے بھی بہت دور ہو کر رہ گئی ہے۔ان میں اردو کا رجحان کیسے پیدا کیا جائے۔

حیدر قریشی : دیکھیں جی کچھ لوگ رضا کارانہ طور پر ذاتی حیثیت سے کچھ نہ کچھ جدوجہد کر رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں ان کی Struggle اپنی جگہ مخلصانہ ہے لیکن اس کا کچھ نہیں ہوگا۔یہ کلچرز کا ٹکراؤ یا ملاپ ہے اس میں ظاہر ہے اردو کہاں Survive کر سکتی ہے۔یہ تو بس ہم جیسے مہاجرین جو آتے رہیں گے، تازہ تازہ آئیں گے۔ان کی وجہ سے اردو کا رونق میلہ رہے گا جو نئی نسل آئے گی ان کے لئے اردو زیادہ سے زیادہ ایک بولنے والی زبان کی حد تک رہ جائے گی تو وہ بھی ایک نسل تک۔دو نسل تک، مطلب پڑھنے اور لکھنے والی اردو نہیں رہے گی۔

عارف فرہاد : آپ کو شعر و ادب میں آئے ہوئے تقریباً 33 سال ہو چکے ہیں، اگر آپ اپنی نگارشات پر نظر ڈالیں تو آپ کو کس صنف میں آپ کا اپنا کام مطمئن کرتا نظر آتا ہے۔

حیدر قریشی : کسی ایک کی میں تخصیص نہیں کر سکوں گا۔شاعری پہلی محبت ضروری ہے، میرا خیال ہے وہی بات جو شروع میں دو بزرگوں کے بارے میں کہی گئی تھی۔مجموعی طور پر مجھے اپنے پورے کام کے بارے میں ایک سطح پر اس حد تک اطمینان ہے کہ جو کچھ میرے دامن میں تھا اسے جس حد تک ممکن تھا ادبی سلیقے سے پیش کر دیا ہے لیکن ایسا اطمینان نہیں ہے کہ بس میں نے جو کچھ پیش کرنا تھا پیش کر دیا۔کیونکہ ایسا اطمینان کبھی نہیں ہونا چاہئے اور خوب سے خوب تر کی تلاش رہنی چاہئے اور وہ نہ رہی تو پھر تو آپ نے لکھنا چھوڑ دیا۔

عارف فرہاد : یعنی آپ دوسرے الفاظ میں اسے ادب کا آل راؤنڈر کہہ سکتے ہیں۔

حیدر قریشی : نہیں مجھے یہ لفظ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔اس کی بجائے اگر آپ زمیندارے والے حساب سے کہیں کہ ایک زمین ہے جو صرف ایک ہی فصل اگاتی ہے اور ایک زمین ہے جس میں سال میں دو تین فصلیں اگائی جا سکتی ہیں۔ایک سے زیادہ فصلیں اگائی جا سکتی ہیں۔

عارف فرہاد : یہ بھی تو ہے کہ ایک ہی زمین میں کئی فصلوں کے بیج بو دیئے جائیں اور بیک وقت وہ سارے ہی Grow کر جائیں۔

حیدر قریشی : یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ زمین اتنی زرخیز ہوتی کہ وہ ساری فصلوں کی نشو ونما کرتی ہے۔

عارف فرہاد : پاکستان یاد نہیں آتا، کیا واپس جانے کو جی نہیں چاہتا؟

حیدر قریشی : یہ جو میں بار بار شروع سے کہہ رہا ہوں کہ اپنے ماضی سے وابستگی، اپنی مقامیت سے وابستگی اور اپنی جڑوں سے وابستگی، تو یہ پاکستان واپس جانے کی ہی بات ہو رہی ہے۔یعنی اپنے گھر کا یاد آنا، گلیوں کا یاد آنا، Even وہ جو گھر کی گلی میں ہوائی چپل پہنے ہوتے اور کوئی پتھر پاؤں سے ٹکرا جاتا اور انگوٹھا زخمی ہو جاتا، مجھے تو اب وہ پتھر بھی یاد آتا ہے۔اس پتھر پہ پیار آتا ہے جس نے زخمی کر دیا تھا۔

عارف فرہاد : اصل میں یہ سوال آپ سے اس لئے کیا گیا ہے کہ پاکستان میں مقیم ہمارے اکثر دوست یہ کہتے ہیں کہ یورپ جا کر لوگ پاکستان کو بھول جاتے ہیں تو میں چاہتا تھا کہ ایک عام آدمی کی رائے کے ساتھ ساتھ ایک ادیب کی رائے بھی جان لی جائے۔مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا

ہے کہ جرمنی میں آ کر مجھے کوئی سنجیدہ ادیب آپ کے علاوہ نظر نہیں آیا بلکہ یوں کہیے کہ اگر شاعر ملا تو وہ وزن میں لکھنے والا نہیں ملا اس کی کیا وجہ ہے۔

حیدر قریشی : (ہنس کر) میں کیا کہہ سکتا ہوں بھئی، میں نے اس کی وجوہات پہلے بڑی وضاحت سے بیان کی تھیں اور بڑی گالیاں کھائی تھیں تو اگر آپ مجھے مزید گالیاں دلوانا چاہتے ہیں تو میں وجہ پھر کھول کر بتا دیتا ہوں۔

عارف فرہاد : جی ہم جاننا چاہیں گے۔

حیدر قریشی : بات یہ ہے کہ جو لوگ یہاں 20، 25 سال سے آئے ہوئے ہیں، جوانی انہوں نے بھرپور گذار لی۔ مڈل ایج Crises میں آئے اب۔ یہاں Well Establish ہو گئے۔ روٹی، روزی کی فکر نہ رہی۔ بچوں کے معاملات میں بھی ایک حد تک آزاد ہو گئے تو اب انہیں یہ خیال آیا کہ نام کمانا چاہئے کسی طرح۔ پرانے زمانے میں لوگ پُل بنواتے تھے۔ کنواں بنواتے تھے۔ مدرسے بنواتے تھے۔ نام کمانے کیلئے یا ثواب کمانے کے لئے۔ اب ثواب کہیں پیچھے چلا گیا ہے اور نام کمانے کی یہ صورت رہ گئی ہے کہ شاعر بن جاؤ۔ اس میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ سادہ سے لوگ ہیں جو جیسی بھی بے وزن شاعری کرتے ہیں ایسے ہی اپنے نام سے چھپوا لیتے ہیں اور اس پر ہی فخر کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو نسبتاً سیانے ہیں اور وہ پلے سے پیسہ خرچ کر کے کتابیں لکھواتے ہیں اور چھپواتے ہیں۔ تو شاعر تو یہاں کوئی بھی نہیں ہے جو میرے ایریئے میں ہیں اور مجھ سے ملے ہوئے لوگوں میں سے جو صاحبِ کتاب بنے ہوئے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی شاعر نہیں ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ ساری کرپشن پھیلانے میں ہمارے ہندوستان اور پاکستان کے بعض اساتذہ Type شعراء جو ہیں وہ برابر کے مجرم ہیں۔

عارف فرہاد : یہ بات واقعی افسوسناک ہے، خدا کرے کہ یہ سلسلہ ختم ہو جائے اور دو نمبر لکھنے والوں کی وجہ سے یہ جو گرد و غبار بیچ میں پیدا ہو جاتا ہے نہ رہے تا کہ ہمارا منظر نامہ اوریجنل لکھنے والوں کی پہچان کرا سکے۔ قریشی صاحب! آپ نے یورپ میں بھی زندگی بسر کی، مشرق میں بھی۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ برائیاں بیان کریں، میں یہ چاہوں گا کہ آپ نے اپنی تہذیب،

مشرقی تہذیب کی جو اچھائیاں محسوس کیں اور یورپ کی جو روایات یا یہاں کی تہذیب میں جو باتیں اچھی لگیں وہ ذرا مختصر بتا دیجئے۔

حیدر قریشی : اگر آپ اجازت دیں تو جو پہلا سوال تھا اس میں تھوڑی سی بات رہ گئی تھی، پہلے میں اس کو بیان کر دوں۔ بات صرف جرمنی میں ہی مقیم شاعروں کی نہیں ہے مجھے لندن میں ملینیم کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اب آپ بتائیں کہ ایک ملینیم کانفرنس ہے جو دو ملینیم کے ایک نکتہ اتصال پر ہو رہی ہے جس میں ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے جید اردو سکالرز بھی تشریف لائے ہوئے ہیں اور وہاں پر مشاعرہ ہوتا ہے۔ آپ یقین کریں میں نے تب لکھا تھا کہ ون تھرڈ شاعر بے وزن پڑھ رہے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آدھے شاعر بے وزن اشعار پڑھ رہے تھے اور داد پا رہے تھے۔ میرا تو اس طرح کی کانفرنسوں سے بھی دل اچاٹ ہو گیا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔ اب آپ کے اگلے سوال کی طرف آتے ہیں تو خوبیاں اور خامیاں جناب یہ۔

عارف فرہاد : خامیاں نہیں......خوبیاں گنوا دیں آپ۔

حیدر قریشی : اچھا......خوبیاں، تو خوبیاں یہ کہ جو مغرب کے لوگ ہیں یہ اپنے ملک سے اپنی قوم سے انتہائی وفادار ہیں اور جن باتوں کو ہم اپنی خوبیاں گنواتے ہیں کہ جھوٹ نہیں بولنا، جھوٹی گواہی نہیں دینی اور بے ایمانی یا ہیرا پھیری نہیں کرنی، مجموعی طور پر یہاں کا معاشرہ ان ساری خوبیوں سے مالا مال ہے اور جو برائیاں ہماری نظر میں برائیاں ہیں، آپ برائیوں کی طرف نہیں آنا چاہ رہے لیکن میں اس کو پھر بھی بیان کروں گا کہ جو برائیاں ہماری نظر میں برائیاں ہیں (جنسی آزادی وغیرہ) وہ حقیقتاً ان کو برائی سمجھتے ہی نہیں ہیں اور وہ ان کے معاشرے کا حصہ ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ جو چیزیں ہمارے ہاں صرف طبقہ اشرافیہ کیلئے مخصوص ہیں وہ یہاں انہوں نے عوام کیلئے بھی عام کر دی ہوئی ہیں کہ اگر اشرافیہ ان کو Enjoy کر سکتا ہے تو عام آدمی بھی Enjoy کر سکتا ہے۔ بس زور زبردستی اس میں کہیں نہیں ہے اور یہی عمل ہمارے ہاں ذرا مختلف ہو جاتا ہے۔ باقی رہ گئی ہمارے مشرق کی خوبیاں تو مشرق کی خوبیاں بہت سی ہیں۔ خاص طور پر ہماری روایات میں جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ رشتوں کا جڑا رہنا ہے۔ اس نے ہم سب کو تسبیح کے دانوں کی

طرح ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔تو یہ ایک ایسی خوبی ہے جس میں باقی چھوٹی چھوٹی برائیاں اور بہت سے عیب چھپ جاتے ہیں مگر یہاں پر یہ صورتحال نہیں ہے کیونکہ فیملی سسٹم ٹوٹا ہوا ہے۔

عارف فرہاد : عرب کا مشہور قولہ ہے السفر وسیلہ ظفر۔ پاکستان سے جرمنی کے سفر میں آپ کو بھی کوئی کامیابی ملی۔

حیدر قریشی : دیکھیں ایک کامیابی تو سیدھی سی ہے نا کہ جو اقتصادی لحاظ سے مسائل تھے وہ سارے ختم ہو گئے۔ پاکستان میں رہتے ہوئے 80 ہزار روپے کا مقروض تھا اور وہ میرے لئے اتنا بڑا قرضہ تھا جتنا غالب کیلئے اپنے زمانے کا قرضہ تھا بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ تھا میرے لئے۔ پاکستان میں رہتے ہوئے میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ میں اسے کیسے اتار سکتا ہوں۔ وہ سارا قرضہ نہ صرف یہ کہ پہلے سال میں ہی اتر گیا بلکہ Relax بھی ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقتصادی لحاظ سے یہ جو آسودگی ہے یہ بہت ضروری ہوتی ہے اور اس کے بعد تخلیق کار کے کام شروع ہوتے ہیں۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب! مجھے یورپ میں تو اردو کا کوئی مستقبل نظر نہیں آیا اور یہ ہماری بدقسمتی بھی ہے لیکن یہ بتائیے کہ کیا جیسے یہاں اردو ادب کا مستقبل نظر نہیں آرہا کیا یہاں مقیم پاکستانیوں کا بھی یہی حال ہے یا اس کے برعکس ہے۔

حیدر قریشی : کن معنوں میں؟

عارف فرہاد : دیکھئے میرا سوال یہ ہے کہ مجھے اردو کا تو یہاں روشن مستقبل نظر نہیں آرہا، جیسا کہ آپ نے بھی ابھی بتایا کہ ہماری نئی نسل اردو سے دور ہو گئی ہے یہاں تک کہ ہم خود یہاں آکر اردو کی بجائے جرمن زبان بولنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں تو کیا پاکستانیوں کا مستقبل بھی اسی طرح سیاہی کی طرف گامزن ہے یا ان کا مستقبل آپ کو روشن ہوتا نظر آرہا ہے؟

حیدر قریشی : بڑا مشکل سوال ہے یہ مجھے سمجھ اس طرح سے نہیں آرہی کہ میں اس کو کس طرح سے Explain کروں لیکن یہ ہے کہ جو پاکستانی یہاں آگئے ہیں وہ Settle ہو گئے ہیں۔ انہیں تو ظاہر ہے اسی معاشرے میں ضم ہونا ہے اور کسی حد تک اپنی شناخت رکھتے ہوئے ہی ضم ہونا

ہے کہ ہم پاکستانی ہیں۔ بنیاد ہماری یہی ہے لیکن اب ہم اس معاشرے کا حصہ بن گئے ہیں گو کہ اس معاشرے میں ضم ہوتے ہوئے ابھی ان کو تین یا چار نسلوں کا ٹائم لگے گا لیکن ہونا یہی ہے آخر کار کہ انہوں نے ان میں جذب ہو جانا ہے، اگر آپ کہیں کہ یہ اپنی پوری پاکستانیت کے ساتھ یہاں رہیں گے تو یہ موجودہ نسل تک ہی ممکن ہے اس سے اگلی نسل میں ممکن نہیں ہوگا۔

عارف فرہاد : آپ کا اب تک جو قیام ہے جرمنی میں اس دوران یہاں سے اردو کے اخبارات و جرائد کون کون سے نکلتے رہے؟

حیدر قریشی : ثریا شہاب اور آپ نے ایک نکالا تھا ماہنامہ ''فورم انٹرنیشنل''۔ ہمارے ارشاد ہاشمی کا اردو دنیا بھی نکلتا رہا ہے۔ اس نے بڑے ہنگامے برپا کئے تھے۔ پچھلے دو تین سالوں سے روزنامہ ''اوصاف'' نکل رہا ہے اور بھی دو تین پرچے نکلے تو ہیں لیکن بس so,so, سے ہی تھے۔ ٹھیک ہے ایک رونق میلہ ہے کہ لوگوں نے بڑی ہمت کی اور اپنے ہونے کا ثبوت دینے کے لئے یہ محنت کی ہے تو جس نے جتنی بھی محنت کی ہے اس کے حساب سے ٹھیک ہے۔

عارف فرہاد : آپ اپنی کوئی پسندیدہ غزل اور ماہیے ہمارے قارئین کو سنانا پسند کریں گے۔

حیدر قریشی : جی ضرور جناب! ایک غزل ہے چھوٹی سی، اس کے اشعار پیش ہیں۔

وہ جو ابھی تک خاک میں رُلنے والے ہیں۔۔۔ سچے موتیوں میں اب تُلنے والے ہیں

اپنی ذات کے دروازے تک آپہنچے۔۔۔۔ بھید ہمارے ہم پر کھلنے والے ہیں

دودھ بدن ہے وہ تو مصری کوزہ ہم۔۔۔۔ سو اب اس کے عشق میں گھلنے والے ہیں

واقفیت ہے ان سے اپنی برسوں کی۔۔۔۔ دکھ تو ہمارے ملنے جلنے والے ہیں

آنکھیں اس کی بھی ہیں اب برسات بھری۔۔۔۔ حیدر میل دلوں کے دھلنے والے ہیں

عارف فرہاد : کچھ ماہیے بھی سنائیے۔

حیدر قریشی : جی ماہیے بھی سنا دیتا ہوں، یار یہ ویسے تو بڑا آکورڈ سا لگتا ہے لیکن میرا دل کرتا ہے کہ ماہیے کی بحث میں چونکہ ہم نے کہیں اس کے وزن کو Discuss نہیں کیا اور وزن کو Discuss کریں تو اس کی ''لے'' آجاتی ہے۔ اس لئے ترنم والا شاعر نہ ہونے کے باوجود بھی

میں یہ چاہوں گا کہ ماہیے تھوڑی سی لے کے ساتھ پڑھنا چاہوں گا۔

عارف فرہاد : جی ضرور

حیدر قریشی :

☆

تھے اپنی ہی لہروں میں
عمر گذاری جو
پنجاب کے شہروں میں

☆

یادوں کے خزینے میں
خانپور اپنا تو
آباد ہے سینے میں

☆

لفظوں کے مداری ہیں
عشق کے جذبے سے
جو شاعر عاری ہیں

☆

رائن سے چناب ملا
کوئی حقیقت تھی
یا خواب سے خواب ملا

عارف فرہاد : بہت بہت شکریہ۔

☆☆

(مطبوعہ عکاس اسلام آباد۔حیدر قریشی نمبر۔شمارہ:۴،اکتوبر ۲۰۰۵ء)

گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ، انڈیا
میں اردو کے استاد
عبدالرب استاد کے سوال اور حیدر قریشی کے جواب

(**نوٹ**: برادرم عبدالرب استاد نے ایک تحقیقی کام کے سلسلہ میں مجھ سے تحریری طور پر چند سوالات کئے تھے۔ان کے جواب میں نے انہیں لکھ کر بھیجے تھے،حال ہی میں سوال و جواب کی وہ ان پیج فائل سامنے آ گئی تو مجھے خیال آیا کہ یہ کوئی باقاعدہ انٹرویو نہ ہوتے ہوئے بھی ایک مختصر سا انٹرویو بن گیا ہے،اس لئے اسے محفوظ کر لیا جائے تو مناسب ہوگا۔عبدالرب استاد صاحب سے رائے لی تو انہوں نے بھی اس کی اشاعت پر بخوشی رضامندی ظاہر کر دی۔سو وہ سوال، جواب پیش خدمت ہیں۔ح۔ق)

سوال: آپ کی پہلی شعری تخلیق کونسی تھی؟ اور کہاں شائع ہوئی؟

جواب: میری پہلی تخلیق ایک غزل تھی،۱۹۷۱ء میں یہ غزل کہی تھی۔

عقل نے جتنا مری راہ کو ہموار کیا
اتنا ہی میرے جنوں نے اسے دشوار کیا

یہ غزل ثاقب زیروی کے رسالہ ویکلی لاہور میں ۱۹۷۲ء کے وسط کے کسی شمارہ میں چھپی تھی۔تاہم میرے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔سعید شباب کی مرتب کردہ کتاب ''انٹرویوز'' کے صفحہ ۲۷ پر اس کا ذکر موجود ہے۔''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کے صفحہ نمبر ۲۰۳ اور ۲۰۴ پر بھی اس کی تفصیل درج ہے۔

سوال: پہلا افسانہ کونسا تھا؟

جواب: اوراق لاہور کے خاص نمبر (اوراق کے پینتیس سال)، شمارہ جنوری، فروری ۲۰۰۰ء
کے صفحہ نمبر ۲۷۲ پر میرے پہلے افسانے کی اشاعت کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ شمارہ وہاں کسی طرح
حاصل کریں۔ مزے کی کہانی درج ہے۔ اوراق کا مذکورہ اقتباس یہاں درج کر رہا ہوں:
''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۱۹۷۹ء کے آخری شمارہ کے ذریعے میری ''اوراق'' میں انٹری ہوئی
تھی۔ میری غزل اوراق میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ غزل کا مطلع تھا:

اک یاد کا منظر سا خلاؤں پہ لکھا تھا
جب ٹوٹتے تاروں سے کوئی جھانک رہا تھا

پھر میرے نام سے میرا پہلا افسانہ ''مامتا'' اوراق کے ۱۹۸۰ء کے پہلے شمارہ میں شائع ہوا۔ یوں یہ
میرا پہلا افسانہ ہوا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے میں افسانہ ''اندھی روشنی'' لکھ چکا تھا اور یہ
افسانہ ''جدید ادب'' خانپور کے ۱۹۷۸ء کے کسی شمارہ میں اپنی بیوی (مبارکہ شوکت) کے نام سے
چھاپ چکا تھا۔ تب رشید امجد اور بعض دیگر جدید افسانہ نگاروں نے چونکتے ہوئے استفسار کیا کہ یہ
مبارکہ شوکت کون ہیں؟، تو مجھے اپنے افسانہ لکھنے پر اعتماد سا ہونے لگا۔ چنانچہ میں نے
افسانہ ''مامتا'' تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ ڈاکٹر انور سدید کو بھیجا۔ ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ وہ
افسانہ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی دیکھ لیا اور وہ افسانہ میرے نام سے چھپنے والا میرا پہلا افسانہ ''اوراق''
کے ۱۹۸۰ء کے پہلے شمارہ میں شائع ہو گیا'' (تاثرات بعنوان ''اوراق اور میں'' مطبوعہ اوراق
لاہور، پینتیس سالہ نمبر شمارہ جنوری، فروری ۲۰۰۰ء)

اس میں اتنا اضافہ کروں گا کہ میرے سب سے پہلے لکھے گئے افسانہ ''اندھی روشنی'' کو معیار دہلی
کے پاکستانی افسانہ نگار نمبر (نیا پاکستانی افسانہ، نئے دستخط مطبوعہ ۱۹۸۲) میں میرے نام کے ساتھ
شائع کیا گیا تھا جو اپنی ابتدائی عمر میں میرے لئے بڑی کامیابی تھی۔

سوال: شروع میں کن شاعروں اور افسانہ نگاروں سے متاثر رہے ہیں؟

جواب: یوں تو میں ابتدائی عمر میں جن اچھے، بُرے شاعروں اور مصنفوں کو پڑھتا رہا ہوں ان
سب سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہا ہوں۔ بعد میں بھی جس کی بھی کوئی اچھی تخلیق پڑھی، اس سے متاثر ہوا
ہوں۔ اس کے لئے نامور اور غیر معروف تخلیق کاروں کی تخصیص نہیں ہے۔ جدید شاعری میں مجھے

اس عہد کے وزیر آغا کی نظم نے بطور خاص متاثر کیا۔ افسانہ نگاروں میں جوگندر پال اور رشید امجد
کے نام پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ ان دونوں سے ابتدا سے ہی متاثر رہا ہوں۔

سوال: جرمنی کی طرف ہجرت کی غرض وغایت؟

جواب: کسی شاعر کا ایک شعر ہے

اذاں پہ قید نہیں، بندشِ نماز نہیں
ہمارے پاس تو ہجرت کا بھی جواز نہیں

لیکن اس شعر کے برعکس میرے پاس ہجرت کے ایسے بہت سارے جواز تھے، اس کے باوجود
وطنِ عزیز کو چھوڑتے ہوئے میں نے خود سے کہا تھا:

کعبۂ دل کو کہاں چھوڑ چلے ہو حیدرؔ
تم تو کہتے تھے یہ ہجرت نہیں ہونے والی

سوال: جدید ادب کے دورِ اول کے کتنے شمارے چھپے؟، دوئم کے کتنے اور اب تک سوئم
کے کتنے شمارے اور نمبر وغیرہ چھپ چکے ہیں؟

جواب: جدید ادب کے دورِ اول کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا اور آخری شمارہ غالباً
۱۹۸۶ یا ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ خاص نمبر دو ہی چھپے۔ ایک جوگندر پال نمبر اور دوسرا سات ادیب
نمبر جس میں سات ادیبوں کے گوشے ایک ساتھ دیئے گئے تھے۔ دورِ دوئم میں صرف دو شمارے
نکال سکا۔ ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۰ء میں دو شمارے۔ دراصل پرچے پر میری مدیرانہ گرفت نہیں تھی۔ جس
دوست کو میٹر بھیج دیا اس نے آگے اپنی مرضی کا بہت کچھ شامل کر لیا۔ موجودہ دور میں بحیثیت مدیر تو
میں پوری طرح رسالہ کو دیکھ رہا ہوں۔ تاہم بعض انتظامی امور میں ابھی بھی مجھے کچھ الجھنیں درپیش
ہیں اور میں ان الجھنوں سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تاہم مدیر کی حیثیت سے رسالے کی ہر سطر
پر میری نگاہ ہوتی ہے اور ساری سیٹنگ میں خود کرتا ہوں۔ انٹرنیٹ کی وجہ سے مجھے یہ سہولت حاصل
ہو سکی ہے۔

سوال: منزہ یاسمین کے مقالہ میں لکھا ہے کہ آپ کی پانچ بہنیں ہیں مگر ماہیے بعنوان 'چند رشتے'
میں آپ نے چار بہنوں کا ذکر کیا ہے؟ (اور یہ ''ماں جائے'' کیا ہے؟)

جواب: اصل بات یہ ہے کہ بچپن میں ایک بہن شمسہ قمر پانچ، چھ سال کی عمر میں ۱۹۶۸ء میں فوت ہوگئی تھی۔اس لئے منزہ والے مقالہ میں تو پانچوں بہنوں کا ذکر آ گیا لیکن ماہیوں میں صرف زندہ بہنوں کا ذکر ہوا ہے۔سال ۲۰۰۶ء میں سب سے چھوٹی بہن فہمیدہ کوثر بھی چالیس سال کی عمر میں فوت ہوگئی ہے۔اب تو تین بہنیں رہ گئی ہیں۔

پنجابی میں ایک ہی ماں سے پیدا ہونے والے بھائی، بہنوں کے لئے ماں جایا اور ماں جائی بولا جاتا ہے۔''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کے صفحہ نمبر ۲۷ پر ایک غزل'' آپی کے لئے'' ہے۔(روایتی محبوب والی غزل، شاید پہلی بار بہن کے رشتہ کے لئے بھی کہی گئی ہے) اس میں بھی ماں جائی کے الفاظ موجود ہیں۔صفحہ نمبر ۳۹ پر نظم درد کے اختتام میں دردوں کو بھی ماں جائے کہا گیا ہے، کہ جنم لیتے وقت ماں دردِ زہ سے گزرتی ہے۔گویا درد بھی (جڑواں) بھائی کی طرح ساتھ ہی جنم لیتے ہیں۔

سوال: سرائیکی قبیلہ ہے یا قوم؟ سرائیکی معاشرے کے بارے میں کچھ وضاحت کردیں۔

جواب: سرائیکی کو کسی زمانہ میں ملتانی زبان بھی کہا جاتا تھا، یہ پنجابی اور سندھی زبانوں کی درمیانی کڑی ہے، جغرافیائی طور پر بھی سرائیکی بیلٹ (بہاولپور، ملتان اور ملحقہ علاقے) پنجاب اور سندھ کے درمیان واقع ہے، اسی توازن یا درمیان کا اثر زبان میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

سوال: سرائیکی زبان کیا علاقائی زبان ہے؟ اگر ایسا ہے تو اردو اور اس میں کتنا فرق ہے؟

جواب: جی ہاں، سرائیکی علاقائی زبان ہے لیکن اس کا علاقہ خاص وسیع ہے۔بہاولپور، ملتان، ڈیرہ غازی خاں، ڈیرہ اسماعیل خاں، میانوالی، جھنگ، یہ سارے سرائیکی علاقے ہیں جو پنجاب سے صوبہ سرحد تک پھیلے ہوئے ہیں۔سندھ اور بلوچستان کے بعض علاقوں میں بھی سرائیکی بولی جاتی ہے اور میں نے خود بعض افغانیوں کو بھی سرائیکی بولتے سنا ہے۔ظاہر ہے ان کے آباواجداد ملتان یا بہاولپور سے ہجرت کر کے افغانستان چلے گئے ہوں گے۔پرانی دکنی اردو میں سرائیکی کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں۔شروع سے لے کر ولی دکنی تک کے اشعار میں ایسے الفاظ عام ملتے ہیں۔سرائیکی میرے نزدیک دراوڑی عہد کی زبانوں کی ہی ترقی یافتہ یا کچھ تبدیل شدہ صورت ہے۔اس کے لوک گیتوں میں دراوڑ کی نشانیوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ایک مشہور سرائیکی

لوک گیت ''رانی پٹھانی۔۔۔۔'' ہے۔اس میں مختلف زیورات کا ذکر ہے اور سب کو ''دراوڑ کی نشانی'' کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔مثلاً:

۱۔کنگن توں گھڑاڈے، دراوڑ دی نشانی۔۔۔ویرَن پَرنیاں آندا ہے، رانی پٹھانی
(یعنی دراوڑ کی نشانی کنگن بنوادو، میرا بھائی ایک پٹھانی رانی کے ساتھ شادی کر کے آرہا ہے)

۲۔ٹکا توں گھڑاڈے، دراوڑ دی نشانی۔۔۔ویرَن پَرنیاں آندا ہے، رانی پٹھانی
(یعنی دراوڑ کی نشانی ماتھے کا ٹیکا بنوادو، میرا بھائی ایک پٹھانی رانی کے ساتھ شادی کر کے آرہا ہے)

اس طرح کوکا، مالا وغیرہ مختلف زیورات کا ذکر کیا گیا ہے۔بظاہر یہ عام سی بات ہے لیکن ایک تو یہ گیت سننے میں بہت میٹھا ہے، شادی بیاہوں پر خواتین شوق سے گاتی ہیں، دوسرے اس میں دراوڑی زیورات کا بار بار تذکرہ بہرحال ایک دلچسپ حوالہ ہے۔

سوال: خانپور اور رحیم یار خاں کے متعلق بھی کچھ بیان ہو، یہاں کی معروف شخصیات، ادبی فضا، خصوصیات وغیرہ۔

جواب: رحیم یار خاں، اور خانپور دونوں شہر سابق ریاست بہاولپور کے معروف شہر ہیں، پچاس کی دہائی میں ساری ریاست کو پنجاب میں شامل کیا جاچکا ہے، لیکن الگ سرائیکی صوبہ یا بہاولپور صوبہ کی تحریکیں بھی وقتاً فوقتاً چلتی رہتی ہیں۔رحیم یار خاں ضلعی صدر مقام ہے، اور خانپور تحصیل ہیڈ کوارٹر۔ملتان کے قریب ایک شہر کا نام میاں چنوں ہے۔یہ غیر متعلق نام اس لئے لکھ رہا ہوں کہ مجھے پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک معروف کمپیئر یاد آ گئے۔ان کا نام قریش پور ہے۔ایک بار کسی نے لکھا تھا کہ پاکستان ایسا ملک ہے جہاں شہروں کے نام رحیم یار خاں اور میاں چنوں اور انسانوں کے نام قریش پور ہوتے ہیں۔باقی میرے علاقے کے ادبی ماحول اور شخصیات کا ذکر آپ کو میرے بعض خاکوں میں اور کھٹی میٹھی یادوں میں آسانی سے مل جائے گا۔

(یہ جواب نامہ مورخہ ۴؍نومبر ۲۰۰۶ء کو تحریر کیا گیا تھا)

مطبوعہ ''خرمن'' بورے والا شمارہ:۱)

حیدرقریشی سے لیا گیا انٹرویو

انٹرویور: نسرین نقاش (سری نگر۔کشمیر)

حیدرقریشی کا نام ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔آپ ایک معجز بیان شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے نثر نگار بھی ہیں۔صحافت میں بھی آپ کا ایک مقام ہے۔آپ کی تحریروں میں توانائی،سنجیدگی،پختگی اور متانت پائی جاتی ہے۔انہوں نے درجنوں کتابیں مختلف موضوعات پر لکھی ہیں۔ان کتابوں کی دنیائے ادب وصحافت میں کافی پذیرائی ہوئی۔ان کی کتابیں ان کی وسعت نظری،مشاہدے اور بلند تخیل وفکر کی عکاس ہیں۔آج ہم ان سے شاعری کے حوالے سے گفتگو کررہے ہیں۔

سوال: یہ بتایئے کہ اپنی ذات کے حوالے سے کی گئی شاعری زیادہ جاندار اور موثر ہوتی ہے،یا معاشرتی اور دوسرے محرکات کے حوالے سے کی گئی شاعری؟

جواب: اچھی شاعری کے لیے ایسا کوئی فارمولا نہیں بنایا جا سکتا۔بات اندر کی ہو یا باہر کی،کسی توازن کے ساتھ کی جائے گی تو اس کی تاثیر بڑھ جائے گی۔تاہم اچھی اور جاندار شاعری کے لیے شاعر کا تخلیقی سطح پر اچھا اور جاندار ہونا ضروری ہے۔

سوال: آپ کی شاعری کا محرک کیا ہے؟

جواب: ایک بار پہلے بھی ایک خاتون نے اسی انداز کا سوال پوچھا تھا،تب میں نے جو کچھ جواب میں کہا تھا اس کا ایک حصہ یہاں بیان کردیتا ہوں:''عام سے دُکھ یا نارمل سی خوشی سے بڑھ کر کوئی بھی دُکھ یا خوشی کی کیفیت مجھے اس طرف مائل کردیتی ہے۔تاہم اس کے لیے مجھے ہمیشہ اپنے اندر کی آواز کا انتظار رہتا ہے۔مناظر ومظاہر فطرت سے میں بے گانہ نہیں رہ سکتا،اسی لیے دیہاتی ماحول کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔آپ مجھے''پینڈو ادیب'' کہیں تو مجھے شرمندگی نہیں ہو

گی،خوشی ہوگی۔محبت کا جذبہ میرے لیے لکھنے کا سب سے بڑا محرک ہوتا ہے لیکن یہ عام سطحی محبت کی بات نہیں ہے۔''

سوال: عام طور پر یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ اردو شاعری میں تصنع اور بناوٹ کا اثر گہرا ہے۔آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: شاعری براہِ راست اپنا مافی الضمیر بیان کرے تو اس میں اکھراپن آجاتا ہے۔اس لیے شاعر کو تشبیہات،استعارات وعلامات کے ذریعے بات کرنا ہوتی ہے۔اس میں پھر یہ ہوتا ہے کہ اچھے شعراء کی بات تو دل میں اترتی محسوس ہوتی ہے اور کمتر شعراء کے ہاں تصنع اور بناوٹ کا احساس ہونے لگتا ہے۔

سوال: آپ شاعری میں حسنِ اظہار کے علاوہ ذرائع ابلاغ کو کس حد تک اہمیت دیتے ہیں؟

جواب: اگر ذرائع ابلاغ واقعتاً کوئی کردار ادا کرنا چاہیں تو ادب کے فروغ اور تہذیبی بقا کے لیے بہت بڑا کردار ادا کرسکتے ہیں۔

سوال: لیکن کیا جدید ذرائع ابلاغ نے شاعر اور شاعری کو مسخ کر کے نہیں رکھ دیا؟اور شعر کو موسیقی اور دوسرے لوازم کا محتاج بنادیا ہے؟

جواب: شاعری کا گایا جانا کوئی بُری بات نہیں۔پرانی فلمی شاعری میں بھی ایک حد تک ادبی رنگ شامل رہا ہے۔ہم آج بھی اُس موسیقی سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ذرائع ابلاغ میں اخبارات،رسائل،فلم،ٹی وی،اور ریڈیو کیساتھ انٹرنیٹ تک بہت کچھ آگیا ہے۔یہ سارے ذرائع ہماری تہذیبی شناخت کے استحکام میں اپنی اپنی جگہ اہم کردار ادا کرسکتے تھے لیکن افسوس کہ ایک محدود سطح تک کہیں کہیں مفید ہونے کے بعد بڑے ذرایع ابلاغ ادب سے بے گانہ ہو چکے ہیں۔فلم اور ٹی وی پر ایسے کردار بطور شاعر پیش کیے جاتے ہیں جو شعر کو بری طرح بے وزن کر کے پڑھتے ہیں۔۔سو جدید ذرایع ابلاغ پر ادب سے بے گانگی کے نتیجہ میں جو کچھ دکھایا جارہا ہے اس سے اتنا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہماری مشرقی تہذیب،مغربی تہذیب کی یلغار کے سامنے مسلسل پسپا ہورہی ہے۔مشاعروں کے شعراء بھی شعرفہمی سے عاری ہوتے جارہے ہیں اور ان کی مشاعروں میں شرکت محض ''شغل میلہ'' کی حد تک ہوتی ہے۔یورپ کے بعض اردو ٹی وی چینلز اور ریڈیوز پر تو

شعروادب کے پروگرام پیش کرنے والے صاحبان بڑے مزے سے بے وزن شعر پڑھ رہے ہوتے ہیں اور داد پا رہے ہوتے ہیں۔

سوال: ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری پر کیا اثرات ڈالے؟

جواب: ترقی پسند تحریک نے پورے اردو ادب پر گہرے اثرات ثبت کئے ہیں۔اردو شاعری پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔نظیرؔ، میرؔ، غالبؔ،اور اقبالؔ کی استثنائی مثالوں سے ہٹ کر غزل روایتی طور پر محبوب کے کوچے یا کوٹھے پر ہی جلوہ افروز تھی۔ترقی پسند تحریک کے نتیجہ میں غزل کوٹھے سے اتری، یار کے کوچے سے نکلی اور شہر کے تنگ و تاریک محلّوں، گلیوں، بازاروں سے ہوتی ہوئی دیہاتوں کے کھیتوں، کھلیانوں تک جا پہنچی۔غزل میں اتنی تبدیلی ہوئی جبکہ نظم میں تو پہلے ہی ترقی پسند موضوعات کو سمونے کے لیے فضا ہموار ہو چکی تھی۔تاہم ترقی پسند تحریک نے خارجی دنیا پر سارا زور لگا کر اور باطن سے بالکل لاتعلقی اختیار کر کے اردو شاعری کو اکہرا کر دیا۔یہ اس کا منفی اثر ہے۔ویسے ۱۹۳۵ء کے زمانی پس منظر سے ساری صورتحال کو دیکھا جائے تو ترقی پسند تحریک کے مثبت اثرات اس کے منفی اثرات سے زیادہ ہیں۔

سوال: ہمارے یہاں جدید نظم کا کیا مقام ہے؟

جواب: اردو شاعری میں اس وقت غزل کے بعد جدید نظم سب سے مقبول شعری صنف ہے۔

سوال: پنجابی زبان کا لوک گیت ماہیا جو اردو میں خاصا مقبول ہو چکا ہے، اور آپ ماہیا کے پارکھ بھی ہیں، یہ بتائیے کہ ہمارے یہاں ماہیا کا مستقبل کیا ہے؟

جواب:۔۔۔تین مصرعوں کی مختلف نظموں کے جتنے تجربات بھی ہوئے ہیں، ان میں سے سب سے زیادہ مقبولیت ماہیا کو ملی ہے۔جہاں تک ماہیا کے مستقبل کے سوال کا تعلق ہے، میں تو ادب کے مستقبل کے سلسلے میں فکر مند ہونے لگا ہوں۔جہاں پورے ادب کی بقا کا مسئلہ بنا ہوا ہو وہاں ماہیا کے بارے میں کیا کہا جائے۔ہاں اگر ادب کا مستقبل بہتر رہا تو ماہیا بھی اپنی جگہ بنائے رکھے گا۔

سوال: شاعری اپنے معاشرے کی تعمیر میں کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟

جواب: مولانا حالیؔ کی مسدس اور اقبالؔ کی مجموعی شاعری اور ترقی پسندوں کی شاعری کا معتبر

حصہ، ان سب کے بارے میں کہا جا سکتا ہے اس شاعری نے اپنے اپنے انداز سے معاشرے کی تعمیر میں کردار ادا کیا۔تاہم یہ چند استثنائی مثالیں ہیں۔ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ شاعر اپنے ماحول سے اثر قبول بھی کرتا ہے اور اپنے معاشرے پر کسی حد تک اثر مرتب بھی کرتا ہے۔لیکن شاعری کے اثرات کے مرتب ہونے کا عمل اتنا آہستہ رو ہوتا ہے کہ اس کا پتہ نہیں چلتا۔بس جو کچھ ہونا ہوتا ہے غیر محسوس طریقے سے ہوتا چلا جاتا ہے۔ویسے معاشرے کی تعمیر میں فوری نوعیت کا کردار ادا کرنے کے لیے جدید ذرائع ابلاغ کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

سوال: یہ کہنا کس حد تک صحیح ہے کہ قلم کار ادب کا سہارا لے کر زندگی کی حقیقتوں کی تلاش میں نکلتا ہے؟

جواب: ایک حد تک یہ بات کہی جا سکتی ہے لیکن یہ تو سطح پر موجود حقیقتوں کو تلاش کرنے والی بات ہوئی۔اچھا تخلیق کار تو سامنے کی حقیقتوں کے عقب میں موجود حقیقتوں یا سچائیوں تک پہنچتا ہے۔

سوال: آپ کا اصل وطن پاکستان ہے۔آپ کے خیال میں علامتی ادب کا اتنے بڑے پیمانے پر رائج ہونے کی کیا وجوہات ہیں؟

جواب: علامتی ادب کے رائج ہونے کی بنیادی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ جنرل ایوب خان کے مارشل لا کے دوران اظہار پر کافی پابندیاں عائد ہو گئی تھیں، اس لیے لکھنے والوں نے علامتی پیرائے میں لکھنے میں عافیت محسوس کی۔لیکن صرف یہی ایک وجہ نہیں ہے۔ہماری پرانی داستانوں اور قصوں کا پیرایۂ اظہار بھی استعاراتی اور علامتی رہا ہے۔پھر مغرب میں جدیدیت کی لہروں نے بھی علامتی ادب کے ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا۔اس طرح کئی وجوہات مل کر علامتی پیرایۂ اظہار کے رواج کا باعث بنتی گئیں۔آج نہ تو پاکستان میں اظہار کی بہت زیادہ پابندی ہے اور نہ ہی کوئی مسئلہ ہے، اس کے باوجود نیم علامتی پیرائے میں ادب تخلیق ہو رہا ہے اور اس کے ابلاغ میں کوئی مشکل بھی پیش نہیں آتی۔معانی کی ایک سے زیادہ پرتیں موجود ہوتی ہیں اور قاری اپنی ذہنی استعداد کے مطابق کسی فن پارے سے حظ حاصل کر سکتا ہے۔

سوال: آج کل کس نوعیت اور کس معیار کے مشاعرے ہو رہے ہیں؟ ان مشاعروں سے اردو

زبان کو فائدہ پہنچ رہا ہے یا نقصان؟

جواب: جب ذرائع ابلاغ بہت کم تھے تب مشاعرہ ایک ادبی تربیتی ادارہ کا درجہ رکھتا تھا۔اس کی تہذیبی، ابلاغی اور ادبی حیثیت ہوتی تھی۔اب ایک تو ذرائع ابلاغ اتنے زیادہ ہو گئے ہیں، پھر بہت معیاری ادبی رسائل میں سے ہر رسالہ بجائے خود ایک تربیت گاہ کا اختیار کر گیا ہے۔اس وجہ سے مشاعرہ کی ادبی اہمیت تو ویسے ہی ختم ہوگئی ہے۔رہی سہی کسر ایسے مشاعروں کے منتظمین اور جعلی و غیر ادبی شعراء کی فوج ظفر موج نے پوری کر دی ہے، جن کی مشاعروں میں اکثریت ہوتی ہے، یوں مشاعرہ کی تہذیبی حیثیت بھی ختم ہوگئی۔اب اسے آپ میلے ٹھیلے جیسی کوئی روایت بنا کر چلائے رکھیں تو چلائے رکھیں لیکن اس میں سے ادب اور تہذیب دونوں منہا ہو چکے۔

سوال: آپ بہت تخلیقی کام کر رہے ہیں، یہ بتائیے اور کیا کیا کرنے کا ارادہ ہے؟

جواب: تخلیقی کام کسی منصوبہ بندی کے تحت تو کیا نہیں جاتا۔یہ تو بس جب ہونا ہوتا ہے، ہو جاتا ہے۔سو اندر سے جب بھی اور جتنی بھی توفیق ملتی رہے گی از خود وہی کچھ ہوتا چلا جائے گا۔

سوال: کیا آپ کوئی تحقیقی کام کر رہے ہیں؟

جواب: تحقیقی کام ماہیے کے حوالے سے ہوا ہے۔اب تک پانچ کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔تین مطبوعہ اور دو غیر مطبوعہ۔ان پانچوں کتابوں کو ایک جلد میں لانے کا ارادہ ہے۔دیکھیں کب ایسا ہو پاتا ہے۔

سوال: ''بین الاقوامی صدا'' کے قارئین کے لیے کوئی پیغام دیجیے!

جواب: پیغام تو کوئی نہیں ہے البتہ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو امن و سکون سے رکھے۔وادیٔ جنت نظیر کو پھر سے امن اور محبت کی دھرتی بنا دے۔اس کے سارے زخم بھر جائیں۔سارے دکھ دور ہو جائیں۔اللہ تعالیٰ غیب سے ایسے سارے اسباب مہیا کر دے۔آمین!

(مطبوعہ ''**بین الاقوامی صدا**'' سری نگر، کشمیر۔شمارہ مئی تا جولائی ۲۰۰۶ء)

سوالوں کے حصار میں

معید رشیدی کا حیدر قریشی سے انٹرویو

جدید ادب کا نام آتے ہی حیدر قریشی کا نام خود بخود ذہن پر دستک دینے لگتا ہے۔حیدر قریشی ایک عرصے سے جرمنی میں مقیم ہے۔وہ شاعر، ادیب، افسانہ نگار، انشائیہ نگار، خاکہ نگار، کالم نگار، رپورتاژ اور سفر نامہ نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔تحقیق اور تنقید سے ان کی دلچسپی ہی نے ان سے وزیر آغا اور ہمت رائے شرما پر مقالے لکھوائے۔انہوں نے اردو ماہیا نگاری پر اب تک سب سے زیادہ کام کیا ہے۔انہوں نے ماہیے کے مزاج اور اس کے اوزان پر بحث کر کے اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔اب تک ان کی تصنیف کردہ غالباً اٹھارہ عدد کتابیں منظر عام پر آ کر داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ان کی شخصیت اور فکر و فن پر پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔وہ پابندی کے ساتھ جرمنی سے 'جدید ادب' نامی خالص ادبی رسالہ نکال رہے ہیں جو کتابی صورت میں چھپنے کے ساتھ انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔

معید رشیدی: عمر کے اس مرحلے میں اپنے فن اور شخصیت کے بارے میں آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

حیدر قریشی: ذاتی زندگی میں کئی حوالوں سے کمی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے بدلے میں خدا نے بعض دوسرے حوالوں سے اتنا مالا مال کر دیا ہے کہ کمی کے احساس کے باوجود دل اس کے شکر سے لبریز ہو جاتا ہے۔جو کچھ بھی مجھے ملا ہے، اُس کے فضل سے ملا ہے اور جو توفیق بھی ملی ہے، اسی کے کرم سے ملی ہے۔سو خدا کی شکر گزاری سے خود کو بھرا ہوا محسوس کرتا ہوں۔

معید رشیدی: اردو ماہیے کے مستقبل پر آپ کی کیا رائے ہے؟

حیدر قریشی: اگر ۱۹۹۲ء کے زمانہ کی صورتحال سے آج تک کی صورتحال کو ایک نظر دیکھا جائے تو

حوصلہ افزا صورت دکھائی دیتی ہے۔ کسی اور مختصر شعری صنف کو اتنی پذیرائی نہیں ملی جتنی ماہیا کو ملی ہے۔ باقی جہاں تک ماہیا کے مستقبل کا سوال ہے تو اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔ ہم تو صرف اچھی امید کر سکتے ہیں۔

معید رشیدی: مابعدِ جدیدیت میں غزل کا کیا چہرہ بن رہا ہے۔ کیا یہ غزل اپنے سابقہ موضوعات کی شدت کو رد کرتی ہے؟ مابعدِ جدید غزل، جدید غزل سے کس حد تک مختلف ہے؟ اس کے امتیازات پر کچھ روشنی ڈالیے۔

حیدر قریشی: بھائی! کون سی مابعد جدیدیت کی غزل؟۔۔۔ جو لوگ اپنی غزل کی بابت ایسا کچھ کہہ رہے ہیں وہ اپنی سادگی اور معصومیت میں محض کسی کو خوش کرنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ ہندوستان میں جس ہستی نے مابعد جدیدیت کی تبلیغ کا بیڑا اُٹھایا تھا، وہ تو اپنی ''معرکتہ الآراء'' کتاب سمیت علمی لحاظ سے اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔ ان کی پوری کتاب انگریزی کتابوں کے سرقہ کا شاہکار ثابت ہو چکی ہے اور انہیں اپنی صفائی میں یا چوری کے الزام سے بریت کے لیے ایک لفظ بھی لکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔ اسے محض الزام تراشی نہیں سمجھیں۔ جدید ادب کے شمارہ:۹ اور ۱۰ کے مضامین پڑھ کر میری بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں جس مابعد جدیدیت کے کرتا دھرتا کا یہ عبرتناک علمی انجام ہوا ہے، اس کے حوالے سے آپ کس مابعد جدید غزل کی بات کر رہے ہیں؟۔۔۔ لگے ہاتھوں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ خود مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں کے نصابوں سے بھی اب اسے خارج کیا جا رہا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے جدید ادب کے شمارہ:۱۱ کا انتظار کیجیے۔

معید رشیدی: تقسیم وطن کے بعد جدیدیت کے رجحان کے نتیجے میں دربدری، تنہائی، مایوسی، لاحاصلی، انتشارِ ذات، شکستِ خواب، بے معنویت، بے مقصدیت، بے چہرگی، نامرادی جیسے موضوعات اردو غزل میں راہ پائے۔ ان موضوعات سے ایک قسم کی منفی فکر عام ہوئی۔ کیا آج بے چہرگی سے چہرگی، دربدری و بے گھری سے زمینی وابستگی، بے یقینی سے یقین اور لاحاصلی سے امید کی طرف مراجعت ہو رہی ہے؟ کیا داخلی شکست و ریخت کا فن کار آج بھی شکار ہے؟

حیدر قریشی: بھائی ہمارے معاشرے میں دربدری، تنہائی، مایوسی، لاحاصلی، انتشارِ ذات، شکستِ خواب وغیرہ سب کچھ پھیلا ہوا ہے۔ معاشرتی ناانصافیوں سے لے کر داخلی اضطراب تک بہت سے تلخ حقائق برصغیر کے عوام کا مقدر بنے ہوئے ہیں، ایسے میں شاعر اور ادیب ان معاملات سے لاتعلق تو نہیں رہ سکتا۔ میرا خیال ہے اپنے معاشرتی اور داخلی مسائل کا سامنا کرتے ہوئے اردو کے تخلیق کار اپنے اپنے طریق کے مطابق اظہار کر رہے ہیں۔ جدیدیت میں انتہا پسندی کی روش تو بہر حال مسترد ہوئی ہے اور ہمارے انتہا پسندی کے کئی مبلغین خود قدیم ادبی ماخذ تک رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ سو ادبی طور پر جو کچھ تخلیق ہو رہا ہے اپنے اپنے حساب سے ہر کوئی ٹھیک ہی کر رہا ہے۔

معید رشیدی: حالیہ منظر نامے پر ہندوستان اور پاکستان کی اردو شاعری اور افسانہ نگاری میں کیا بنیادی فرق محسوس کرتے ہیں؟

حیدر قریشی: دونوں طرف کے لکھنے والوں کے ہاں اپنی اپنی مقامیت کی چاشنی سی گھلی ہوتی ہے جو دوسروں کو کبھی بھلی معلوم ہوتی ہے تو کبھی کبھار نامانوس بھی لگتی ہے، بس باقی تو دونوں طرف ایک جیسا ہی ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے بنیادی فرق کہہ لیں۔ حالانکہ یہ کوئی ایسا بڑا فرق نہیں ہے۔

معید رشیدی: اپنے رسالے جدید ادب، کی مجلس مشاورت سے گوپی چند نارنگ کو آپ نے کیوں الگ کر دیا؟

حیدر قریشی: دراصل میں جدید ادب میں کسی مجلس مشاورت کے حق میں نہیں تھا۔ دو دوستوں کے اصرار پر اس کا سلسلہ شروع کیا۔ تب میں نے نارنگ صاحب سے بات کی۔ انہوں نے شمولیت کے لیے حامی بھر لی، اور مشاورت کے طور پر اپنا ایک انٹرویو بھیج دیا، میں نے اسے شمارہ:۴ میں شائع کر دیا۔ شمارہ:۵ کے لیے انہوں نے اپنی ''معرکتہ الآراء'' کتاب ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' کے بارے میں اپنے کسی نیازمند کا طویل مضمون بطور مشیر عنایت کر دیا۔ مابعد جدیدیت کے ڈرامہ کو سمجھ لینے کے بعد اس کے سلسلہ میں مجھے شروع سے ہی تحفظات

رہے ہیں،سوظاہر ہے میں نے وہ مضمون شائع نہیں کیا۔اور ساتھ ہی نارنگ صاحب کی اس قسم کی مشاورت سے بچنے کے لیےان کا نام ایک ہی شمارہ کے بعد حذف کر دیا۔ویسے سچی بات ہے میں اب بھی مجلس مشاورت کے حق میں نہیں ہوں۔محض دو دوستوں کی ضد کے آگے خاموش ہوں۔شاید اب بول پڑوں۔ویسے نارنگ صاحب کے حوالے سے یہ وضاحت کر دوں کہ اگر چہ میں نے ان کی ''معرکتہ الآراء'' کتاب پر لکھے ہوئے مضمون کو شمارہ:۵ کے لیے ان کے بھیجنے کے باوجود شائع نہیں کیا تھا لیکن اس کے بعد شمارہ نمبر ۹ اور ۱۰ میں اسی کتاب پر تفصیلی مضامین چھپے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ کہیں رُکا نہیں ہے۔

معید رشیدی: کہا جاتا ہے کہ یہ فکشن کا دور ہے۔کیا اردو شاعری کے لیے یہ دور ساز گار نہیں جبکہ یہ بھی مسلم ہے کہ اردو غزل کو فروغ کے لیے انتشار و آشوب کا ماحول راس آتا ہے۔کیا موجودہ ماحول انتشار و آشوب سے پاک ہے؟

حیدر قریشی: مجھے تو لگتا ہے کہ ادب کا دور ہی ختم ہو رہا ہے۔میڈیا کی وسعت اور اثر پذیری کے نتیجہ میں ہمارے ہاں میڈیا کر دانشور پیدا ہو رہے ہیں۔ادب تو میڈیا کے کسی کونے میں بھی دکھائی نہیں دیتا۔سیدھی بیانیہ کہانی کے لیے تو اب مزید مشکل پیدا ہو گئی ہے کہ ایسی کہانیاں لکھنے والوں سے تو بعض کالم نگار زیادہ اچھے،دلچسپ اور پر تاثیر کالم لکھ لیتے ہیں۔اگر ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے نئی صورتحال کے سامنے اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں غور وخوض کر کے نئے رستے نہ تراشے تو شاید سچ مچ ہم ادب کے اختتام کے دور میں داخل ہو جائیں۔

معید رشیدی: موجودہ عہد میں ادبا و شعرا کی ذمہ داری کیا بنتی ہے؟

حیدر قریشی: میرا خیال ہے ابھی جس ذمہ داری کا ذکر ہوا ہے وہی اس وقت ایک چیلنج کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔اگر اس سے عہدہ براء ہونے کی کوئی صورت نکل آئی تو ادب کے لیے نیک فال ہوگی۔

معید رشیدی: آئندہ آپ کی کون کون سی کتابیں آنے والی ہیں؟

حیدر قریشی: افسانوں کے انگریزی تراجم کی کتاب And I Wait! اشاعت کے مراحل میں

ہے۔اس میں میرے تمام افسانے شامل ہیں۔اس کے علاوہ **عمرِ لاحاصل کا حاصل** کا نیا ایڈیشن بھی زیر ترتیب ہے،جس میں،ایک نیا شعری مجموعہ،۲ نئے افسانے،یادوں کے تین نئے ابواب اور مزید چند اضافے شامل ہوں گے۔اس کی جلد اشاعت متوقع ہے۔ماہیا کی تحقیق وتنقید پر میری پانچ کتابوں کا مجموعہ بھی زیر ترتیب ہے۔اس وقت تو یہی کچھ ذہن میں آرہا ہے۔شاید ایک دو اور کتابیں ابھی زیر تکمیل ہیں۔

معید رشیدی: اردو کی نئی بستیوں میں اردو کے فروغ کے کیا امکانات ہیں؟

حیدر قریشی: آج (سات اپریل ۲۰۰۸ء کو) صبح مجھے امریکہ سے نیر جہاں صاحبہ کا ٹیلی فون آیا۔انہوں نے نارنگ صاحب کے حوالے سے جدید ادب میں چھپے مضامین کا سنا تھا،اس بارے میں کہنے لگیں کہ جب مجھے علم ہوا تو میں نے ایک صاحب سے کہا کہ ایک بات تو ہے کہ حیدر قریشی جب خود کسی کے بارے میں لکھے یا کسی کا ایسا لکھا چھاپے،آپ بے شک اس سے کتنا ہی ناراض ہو لیں لیکن وہ حقائق سو فیصد درست ہوتے ہیں۔میرے بارے میں اردو کی نئی بستیوں میں ایسا تاثر بن رہا ہے تو مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے۔اب میری ذمہ داری اور بڑھ گئی ہے۔سو صاحب!اردو کی نئی بستیوں میں اردو کے فروغ کا کوئی زیادہ امکان نہیں ہے۔یہ بستیاں نصف صدی سے زائد عرصہ میں ایک بھی ایسا اردو شاعر یا ادیب پیدا نہ کر سکیں جو یہاں کی پیدائش ہو،یہیں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی ہو اور پھر وہ اردو کا شاعر یا ادیب بنا ہو۔تو جناب جتنی رونق ہے سب ترکِ وطن کر کے آنے والوں کی ہے۔اس میں بھی اکثریت شوقیہ بے وزن شاعروں کی ہے۔پھر ایک بڑی تعداد ان جعلی شاعروں اور شاعرات کی ہے جو ہندوستان اور پاکستان کے شاعروں سے معقول معاوضہ پر پورے مجموعے لکھواتے اور چھپواتے ہیں۔مناسب لکھنے والوں میں بھی جینوئن اور غیر جینوئن کی واضح تفریق موجود ہے۔ادب کے سنجیدہ لوگ بہت کم تعداد میں ہیں اور وہ سب بھی زیادہ تر گوشہ نشین رہ کر اپنا ادبی کام کرتے ہیں۔میں اس حوالے سے پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں،سو اب اتنے لکھے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

معید رشیدی: نئی نسل کے نام کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

حیدرقریشی: یہ جو آج ساری دنیا انتشار کا شکار ہو رہی ہے، یہ سب مختلف پیغامات کا نتیجہ ہے۔ ہر کوئی اپنے اپنے ملنے والے پیغام پر ڈٹا ہوا ہے اور یوں امن اور محبت کے نام پر بدامنی اور نفرت کو فروغ دے رہا ہے۔ جب پہلا انتشار ہی پیغامات کا نتیجہ ہے تو جناب میں کوئی نیا پیغام دے کر ان نفرتوں میں کوئی حصہ نہیں ڈالنا چاہتا۔ میں اپنی مقامی صورتحال سے لے کر عالمی صورتحال تک کو دیکھ رہا ہوں اور بے حد افسردہ اور دُکھی ہو رہا ہوں!

سات اپریل ۲۰۰۸ء کو لکھا گیا

(اردو دوست ڈاٹ کام کے انٹرنیٹ میگزین اردو ورلڈ شمارہ:۷، سال ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا)

حیدرقریشی سے انٹرویو

محمد عاصم بٹ (اسلام آباد)

محمد عاصم بٹ : بچپن میں گھر میں کتاب بینی کی کیا صورت تھی؟ کتابوں سے تعلق کیسے بنا؟

حیدر قریشی: اسکول میں داخلہ سے پہلے والد صاحب مجھے دوکان پر اردو سکھایا کرتے تھے۔ میں نے پہلی جماعت میں داخلہ سے پہلے اخبار پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ گھر پر والد صاحب کے پاس دینی کتب کا ذخیرہ موجود تھا، انہیں بھی سرسری دیکھا کرتا تھا۔ تب میرے پیش نظر موضوع نہیں اردو زبان ہوا کرتی تھی۔ سو اردو میں جو کچھ بھی سامنے آتا تھا پڑھ لیا کرتا تھا۔ یہ سب والد صاحب کی دی ہوئی بالکل ابتدائی تعلیم و تربیت کا ثمر تھا۔ اسی عادت نے کتاب بینی تک پہنچایا۔

محمد عاصم بٹ : لکھنے کا آغاز کیسے ہوا؟

حیدر قریشی: چھوٹی موٹی تک بندی تو اسکول کے زمانے سے شروع ہو گئی تھی۔ میں نے ہوم ورک کی کاپی پر ایک ناول لکھا، جس کا تخلیق کار بھی میں ہی تھا اور قاری بھی میں ہی تھا۔ اس ناول کی ہیروئن نہایت خوبصورت اور نہایت امیر تھی اور ہیرو نہایت غریب تھا جو میں خود تھا۔ میں اسے لکھتے ہوئے بھی روتا رہا اور پڑھتے ہوئے بھی روتا رہا اور آج جب اس کا ذکر کر رہا ہوں تو میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ہے۔ شاعری بھی سکول کے زمانے میں شروع کر دی تھی۔ کہیں چھپنے کے لیے بھیجی، وہاں سے ناقابلِ اشاعت ہونے کی اطلاع آئی تو بہت شرمندگی ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں باقاعدہ شعر گوئی کا آغاز ہوا، یہ شاعری چھپنے لگی، جس سے میرے اندر اعتماد پیدا ہوتا گیا۔

محمد عاصم بٹ : آپ کیوں لکھتے ہیں؟

حیدر قریشی: ابتدائی ایام میں یہ سوال پوچھا جاتا تو شاید اس کا کچھ کچا پکا جواب سوجھ جاتا۔ اب جو جاننے کی کسی معمولی سی سطح تک آیا ہوں تو مجھے خود معلوم نہیں ہو پا رہا کہ میں کیوں لکھتا

ہوں۔لیکن یہ حقیقت ہے اب لکھنا، پڑھنا میرے جینے کا ایک بہانہ ہے۔

محمد عاصم بٹ : لکھنا آپ کے لیے آسان ہے،خوشگوار یا تکلیف دہ؟

حیدر قریشی: جیسا ابھی عرض کیا ہے کہ زندگی بسر کرنا اور لکھنا میرے لیے ایک جیسا ہے تو جیسے زندگی میں خوشگوار اور تکلیف دہ کیفیات آتی رہتی ہیں،ویسا ہی لکھنے کے عمل کے دوران بھی مختلف کیفیات بنتی، بدلتی رہتی ہیں۔البتہ زندگی بھر لکھنے کے عمل سے گزرنے کے بعد اب جب بھی لکھنے کا موڈ بن جائے تو لکھنا مشکل نہیں رہتا۔ بلکہ موڈ بن جانے کی وجہ سے ایسی روانی آجاتی ہے کہ لکھنا آسان ہو جاتا ہے۔

محمد عاصم بٹ : لکھنے کی تحریک کیسے ملتی ہے؟

حیدر قریشی:غم یا خوشی کی کوئی بھی غیر معمولی کیفیت لکھنے کی طرف مائل کر دیتی ہے۔بہت اچھا ادب پڑھنے سے بھی غور وفکر کی تحریک ملتی ہے جو بالآخر خود بھی کچھ لکھنے کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ فارمولا نہیں ہے لیکن ایسا بھی ہوا ہے۔

محمد عاصم بٹ : لکھنے سے پہلے تیاری کی کیا صورت ہوتی ہے؟

حیدر قریشی:اپنے ایک افسانہ''کاکروچ'' کا خیال سوجھنے کے بعد میں نے فزکس کے بعض پروفیسر صاحبان سے متعلقہ نکات پر کافی گفتگو کی تھی اور بنیادی سائنسی نکتے کو آسان پیرائے میں سمجھا تھا۔اسی طرح اپنی یادوں کے بعض ابواب میں مجھے روح،جسم،دوسرے جنم،حیات بعدالموت،کلوننگ وغیرہ جیسے موضوعات پر اپنے موقف کو بیان کرنے کے لیے اپنے مطالعہ کو اپ ڈیٹ کرنا پڑا تھا۔ماہیے کی بحث میں کچھ کچا پکا عروض بھی سیکھنے کی کوشش کی تھی،بعض مضامین میں تحقیقی حوالے سے تھوڑی محنت بھی کرنا پڑی۔ یہ چند استثنائی مثالیں ہیں تاہم عام طور پر اور تخلیقی سطح پر لکھنے سے پہلے مجھے کسی خاص تیاری کی ضرورت پیش نہیں آتی۔دل میں اور ذہن میں جو کچھ پہلے سے چل رہا ہوتا ہے اسی میں شاید سارا ہوم ورک از خود ہو چکا ہوتا ہے۔

محمد عاصم بٹ : لکھنے کا معمول کیا ہے؟

حیدر قریشی: پاکستان میں بھی اور جرمنی میں بھی لکھنے کا کوئی باقاعدہ معمول نہیں بن سکا۔بس جب موڈ بن گیا اور وقت نے بھی مہلت دے دی تو کچھ نہ کچھ لکھنے کی توفیق مل گئی۔تین مہینوں میں چار بار دل کی سرجری سے گزرنے کے بعد سال ۲۰۱۰ء میں جب مجھے مہینہ

بھر Rehabilitation کے لیے ایک کلینک میں داخل ہونا پڑا تو میں نے اپنی کتاب''اردو ماہیا تحقیق وتنقید'' کو وہیں مکمل کیا۔ یہ پانچ کتابوں کا مجموعہ ہے جو ۵۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ خاصا مشقت طلب کام تھا جو گھر پر نہیں ہو پا رہا تھا لیکن جیسے ہی کلینک کی فرصت میسر آئی میں اسے نمٹانے میں کامیاب ہو گیا۔سوکسی معمول کے بغیر جب بھی اور جہاں بھی ادبی کام کی توفیق مل جائے، خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔

محمد عاصم بٹ : اوسطاً کتنا اور کون سا وقت لکھنے پڑھنے کو دیتے ہیں؟

حیدر قریشی: لکھنے کے لیے تو توفیق ملنے پر منحصر ہے،تاہم پڑھنے کے لیے میں نے جرمنی کی مصروف زندگی میں کچھ رستے نکال لیے ہیں۔جاب پر جاتے ہوئے،ڈاکٹر کے پاس اپائنٹ منٹ کی صورت میں یا کسی بھی اور محکمہ میں اپائنٹ منٹ کی صورت میں کوئی ایسی کتاب/رسالہ ساتھ لے جاتا ہوں جسے پڑھنا چاہتا ہوں۔سفر اور انتظار کے لمحات میں مطالعہ کا کافی وقت مل جاتا ہے۔تاہم چھٹی کے روز گھر پر بھی کچھ نہ کچھ وقت نکال لیتا ہوں۔

محمد عاصم بٹ : لکھنے پڑھنے کے حوالے سے بہترین نصیحت جو آپ کو ملی یا آپ دوسروں کو دینا چاہیں؟

حیدر قریشی: ہمارے اچھے بھلے ادیبوں میں بھی مطالعہ کی عادت کم ہوتی جا رہی ہے،اسی طرح لکھنے والوں کی ایک ایسی کھیپ موجود ہے جسے لکھنے کی بھی عادت نہیں ہے۔نصیحت کسی کو کیا کی جائے بس اتنی نشان دہی کافی ہے،اثر کرنا ہوا تو اتنی سی نشان دہی بھی اثر کر جائے گی۔

محمد عاصم بٹ : پسندیدہ کتابیں/ادیب Qoutes؟

حیدر قریشی:وزیر آغا کی''آدھی صدی کے بعد'' اور''اک کتھا انوکھی'' دونوں نظمیں مجھے بہت پسند ہیں۔ادیب تو بہت سارے پسند ہیں، جتنے نام بھی لکھے لسٹ ادھوری رہے گی۔

محمد عاصم بٹ : آج کل کیا پڑھا اور کیا لکھ رہے ہیں؟

حیدر قریشی:پڑھنے کے لیے میرے پاس ان دنوں ناصر عباس نیر کی بھیجی ہوئی کتاب''آزاد صدی مقالات''ہے۔یہ کتاب مولانا محمد حسین آزاد کی صدی کی مناسبت سے ہونے والے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔لکھنے کے میدان میں تنقیدی مضامین کے اپنے چاروں مجموعوں کو یکجا کرنے کا کام کر رہا ہوں۔ یہ مجموعہ''ہمارا

ادبی منظر نامہ‘‘ کے نام سے شائع ہو سکے گا۔اس میں چند نئے مضامین شامل کر رہا ہوں جو زیرِ تحریر ہیں۔شاعری تو ویسے ہی معمول کا حصہ ہے،سو ہوتی رہتی ہے۔

محمد عاصم بٹ : تخلیقی آدمی ایک عام آدمی سے کس طرح مختلف ہے؟

حیدر قریشی: میں خود کو ایک عام آدمی سمجھتا ہوں،بس اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ادب کی تھوڑی سی سوجھ بوجھ بخش دی اور ادبی کام کرنے کی تھوڑی سی توفیق بھی عطا کر دی۔سو میں تو عام آدمی سے کسی طور مختلف نہیں ہوں۔

محمد عاصم بٹ : آپ کیسا معاشرہ چاہتے ہیں؟

حیدر قریشی: ایسا روادار معاشرہ جہاں ہر انسان اپنے نظریات اور خیالات کے ساتھ آزادانہ اور پُر امن زندگی بسر کر سکے۔

محمد عاصم بٹ : کیا ادب کے ذریعے کوئی تبدیلی ممکن ہے؟

حیدر قریشی: ادب کے ذریعہ کسی معاشرے پر کوئی اثر ہوتا بھی ہے تو اس کی رفتار بہت آہستہ ہوتی ہے۔کسی معاشرے کی تہذیبی تبدیلی میں تو ادب کا حصہ نہایت موثر ہو سکتا ہے لیکن انقلابی تبدیلی ادب کے ذریعے بہت مشکل ہے۔مغربی دنیا میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان میں وہاں کا فکری سطح پر ہونے والا کام کسی نہ کسی طور کارفرما ہوتا ہے تاہم اس کے لیے وہ لوگ دوسرے ذرائع اور وسائل کو بھی بروئے کار لاتے ہیں۔ہمارے ہاں جو انقلابی یا باغی ادب پیدا ہوا ہے وہ فی ذاتہ کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکا۔ہاں جب کسی معاشرے میں انقلابی تبدیلی کا وقت آتا ہے تب آپ ادب کے نام پر کچھ لکھیں یا نہ لکھیں وہ تبدیلی آ کر رہتی ہوتی ہے۔انقلابی گرما گرمی کے ماحول میں جو لکھنے والے موقعہ سے سیاسی فائدہ اٹھانے کے لیے کچھ لکھتے ہیں،اس کی ادبی حیثیت مشکوک ہوتی ہے۔

محمد عاصم بٹ :اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1،اسلام آباد، پاکستان،
فون:0092 51 9250572

تحریر کردہ:۱۳مارچ ۲۰۱۱ء

ادبی رسائل کے حوالے سے

سوالات از عزیز نبیل (قطر)،جوابات از حیدر قریشی (جرمنی)

سوال نمبر۱: برائے مہربانی جدید ادب کی ابتدا کے متعلق بتائیں کہ پہلا شمارہ کب اور کہاں سے شائع ہوا؟اور کیا ابتدا سے آپ ہی جدید ادب کے مدیر ہیں؟

جواب: جدید ادب کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں خان پور سے شائع ہوا تھا۔یہ اسی صفحات پر مشتمل تھا۔خان پور سے یہ رسالہ ۱۹۸۶ء تک نکلتا رہا۔ابتدا سے اس کا مدیر میں ہی ہوں۔بعض اور احباب بھی شریک رہے لیکن وہ زیادہ تر عارضی طور پر ساتھ دینے والے احباب تھے جو بہت جلد ساتھ چھوڑ جاتے رہے۔ہاں فرحت نواز صاحبہ پاکستانی دور میں آخر تک،۱۹۸۶ء تک ساتھ رہیں ۔جرمنی سے اس رسالہ کو ۱۹۹۹ء میں جاری کیا لیکن دو شماروں کے بعد اسے بند کر دیا۔جولائی ۲۰۰۳ء سے ایک بار پھر جرمنی سے اسے جاری کیا اور تب سے اب تک یہ باقاعدگی سے ہر چھ ماہ کے بعد شائع ہو رہا ہے۔

سوال نمبر۲: اردو رسائل و جرائد اور بطورِ خاص اردو ادب سے متعلق رسائل کو کس طرح کے مسائل کا سامنا ہے اور کیا ان مسائل کا کوئی حل ممکن ہے؟

جواب: جو لوگ سنجیدگی کے ساتھ ادب کی ترویج و ترقی کے لیے ادبی رسائل نکال رہے ہیں،اندھیرے میں چراغ جلانے کا کام کر رہے ہیں۔اندھیرا بہت گھنا ہے۔دوسرے اخبارات و جرائد کو حکومت اور بڑی کمپنیوں کی طرف سے جو بھاری بھرکم اشتہارات ملتے ہیں،ادبی جرائد کو ان کا ہزارواں حصہ بھی مل جائے تو ادبی رسائل اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔عوام اپنے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں،ادب ان کے نزدیک ثانوی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔حکومت اور کمپنیوں کی ترجیحات اپنے مفادات کے مطابق ہیں۔کوئی مدیر اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر کہیں سے کچھ حاصل

کر لیتا ہے تو اس کی اپنی ہمت کی بات ہے وگرنہ ادبی رسائل میں کسی کی دلچسپی ہی نہیں تو ان کے پرسان حال کہاں سے آئیں گے؟ دنیا جس ڈگر پر جارہی ہے اس کے پیش نظر ادبی رسائل کے مسائل کا، خاص طور پر مالی مسائل کا باضابطہ اور اصولی نوعیت کا کوئی حل نہیں ہے۔ سو جس مدیر سے جو بن پڑتا ہے اپنی توفیق کے مطابق کر رہا ہے۔

سوال نمبر۳: اردو شعراء و ادباء کی نئی نسل کے لیے رسائل کے دروازے کس حد تک کھلے ہوئے ہیں؟

جواب: نئی نسل کے شعراء و ادباء کے لیے ادبی رسائل کے دروازے تو کھلے ہیں لیکن اس حوالے سے بہت سی قباحتیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً نئی نسل کے بہت سارے لکھنے والے سماجی روابط کی ویب سائٹس پر لکھنے کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ حالانکہ وہ ویب سائٹس فوری رابطہ کی حد تک تو مفید ہیں لیکن وہاں معیار کی اہمیت بے معنی ہو کر رہ چکی ہے۔ غیر معیاری تحریر کی بے جا توصیف اور معیاری تخلیقات کی بے توقیری کے کئی مناظر وہاں موجود ہیں۔ دوسری طرف ہمارے بہت سارے ادبی رسائل کے مدیران ''اردو کی بین الاقوامیت'' سے مرعوب ہو کر بیرون ملک اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی طرف خصوصی توجہ کرنے لگے ہیں۔ جبکہ ان ''بین الاقوامی اردو شاعروں اور ادیبوں'' میں ایک بڑی تعداد دو نمبر قسم کے شاعروں اور ادیبوں پر مشتمل ہے۔ نئی نسل ادبی رسائل کی دیرپا اہمیت سے بے خبر ہے اور ادب کی شو بز ٹائپ سرگرمیوں پر ہی فرحاں و شاداں ہے۔ نئی نسل کے شعراء و ادباء ہی نہیں اب تو کئی سینئر لکھنے والے بھی ادب میں سنجیدہ اور بامعنی سرگرمی سے زیادہ ادب کی شو بز لائن میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔

سوال نمبر۴: آج کل بہت زیادہ رسائل و جرائد بازار میں آتے ہیں اور کچھ شماروں کی اشاعت کے بعد غائب ہو جاتے ہیں کیا وجہ ہے؟

جواب: عمومی طور پر مالی وسائل کی کمیابی کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ رسالہ فروخت بھی نہ ہوتا ہو اور اس کے لیے اشتہارات بھی میسر نہ ہوں تو ظاہر ہے کہ نقصانِ مایہ و شماتت ہمسایہ کے بعد رسالہ بند ہی ہونا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ شہرت کے حصول کے لیے ادارت کو اچھا شارٹ کٹ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب جلدی میں کچھ ملتا دکھائی نہیں دیتا تو پھر رسالہ بند کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے کئی لوگوں کو میں

جانتا ہوں جنہوں نے طمطراق سے رسالے کے اجراء کا اعلان کیا لیکن جب ادبی رسالہ نکالنا مشکل دکھائی دیا تو پھر کسی اور شارٹ کٹ کی طرف نکل گئے۔ جرمنی، انگلینڈ اور اٹلی تک ایسے ''مدیرانِ کرام'' کو جانتا ہوں جو بن کھلے ہی مرجھا گئے۔ تاہم صرف ادارت کی حد تک مرجھانے کی بات ہے، دوسرے شارٹ کٹس میں وہ لوگ کامیاب ہیں۔ تاہم علم و ادب کی سنجیدہ سطح پر ایسے لوگ کسی شمار میں نہیں آتے۔

سوال نمبر۵: کیا وجہ ہے کہ زیادہ تر رسائل کا مواد مطبوعہ ہوتا ہے۔ خصوصی طور پر اہم لکھنے والوں کی تخلیقات پہلے بھی کہیں نہ کہیں شائع ہو چکی ہوتی ہیں؟

جواب: اس بات کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ پرانے مطبوعہ مواد میں تو ''گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را'' کا پہلو شامل ہوتا ہے۔ جبکہ زندہ ادیبوں کی نگارشات ایک سے زیادہ رسائل میں چھپنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ رسائل کا حلقۂ قرات خاصا محدود ہوتا جا رہا ہے۔ انڈیا میں بہت کم رسائل ہیں جو پورے ہندوستان تک پہنچتے ہوں۔ پاکستان میں بھی یہ حال ہے کہ لاہور والے کراچی والوں سے اور کراچی والے لاہور والوں سے زیادہ باخبر نہیں ہوتے۔ ایسی فضا میں اگر کوئی لکھنے والا مدیران کو بتا کر اپنی نگارشات ایک سے زائد رسائل کو بھیج دیتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ جو نئے رسائل اچھے ادیبوں سے رابطہ کیے بغیر اور ان کی اجازت کے بغیر ان کی تخلیقات کو اٹھا لیتے ہیں وہ مناسب عمل نہیں ہے اور اسے ادارتی کامیابی کا شارٹ کٹ ہی کہا جانا چاہیے۔

سوال نمبر۶: کیا اردو کے ادبی رسائل و جرائد کا زرّیں عہد گزر چکا ہے؟

جواب: بظاہر ایسا لگتا ہے لیکن ایسا ہے نہیں۔ لگتا اس لیے ہے کہ ماضی کی اچھی چیزیں یاد بن جاتی ہیں، خامیوں کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ آپ پرانے زمانے کے عہدِ زریں والے ادبی جرائد کو اٹھا کر ان کے مندرجات دیکھیں اور ان کا موازنہ آج کے اچھے ادبی جرائد کے مندرجات کے ساتھ کریں، آپ کو ادبی رسائل و جرائد کے معیار سے ایسی کوئی شکایت محسوس نہیں ہوگی اور ادب کے ارتقا کا ایک منظر بھی صاف دکھائی دے گا۔

سوال نمبر۷: موجودہ سائبر دور میں جب انٹرنیٹ انسان کی تمام ضروریات کی تکمیل الیکٹرانک انداز میں پوری کر رہا ہے، مستقبل میں رسائل و جرائد کی کتابی صورت میں اشاعت اور موجودگی کے کیا امکانات ہیں؟

جواب: یہ سوال فکر مند ضرور کرتا ہے، تشویش جو پہلے ہلکی سی ہوا کرتی ہے قدرے زیادہ ہو رہی ہے لیکن ایک امید ہے کہ کتاب کا مستقبل ختم نہیں ہوگا۔ تاہم ادبی رسائل کے لیے دہری تشویش ہے۔ ایک تو کتاب کے مستقبل کے حوالے سے کہ کتاب رہی تو ادبی رسالہ بھی رہے گا۔ لیکن دوسری تشویش خود ادب کے مستقبل کے حوالے سے ہے کہ دنیا ترقی کی جس نہج پر اور جس رفتار سے آگے جا رہی ہے اس کے باعث دنیا میں ادب کا مستقبل کیا ہوگا۔ اگر ادب کا مستقبل مخدوش ہوتا چلا گیا تو کتاب کے خاتمہ کے بغیر بھی محدود تعداد والے اچھے ادبی رسائل کا حلقہ مزید محدود ہو جائے گا۔ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے، جیسی صورت بن جائے گی۔

سوال نمبر۸: کیا آپ کو اپنے رسالے کے زیادہ تر نسخے اعزازی طور پر شعراء و ادبا کو روانہ کرنے پڑتے ہیں؟

جواب: زیادہ تر نسخے نہیں جناب۔۔سارا رسالہ ہی اعزازی جاتا ہے۔ میں نے اپنے رسالے پر قیمت درج ہی نہیں کرائی۔ ایک بار چند دوستوں کے اصرار پر قیمت درج کرائی تو اتنی شرمندگی ہوئی کہ پھر فوراً پہلی ڈگر پر آ گیا۔ ہاں کچھ دوست ڈاک خرچ کے طور پر یا ویسے تعاون کے طور پر کبھی کبھار کچھ عنایت کر دیتے ہیں تو ان کا شکر گزار رہتا ہوں۔ جو مدیرانِ جرائد ادب کے قارئین اور ادیبوں کو اپنا رسالہ سہولت کے ساتھ قیمتاً بھیجتے ہیں، مجھے ان کی کامیابی سے خوشی ہوتی ہے۔

سوال نمبر۹: کیا آپ اپنے رسالے میں شامل تمام مشمولات کے معیار سے مکمل طور پر مطمئن ہوتے ہیں۔؟ اور یہ بھی بتائیں کہ کیا ہم عصر رسائل و جرائد قارئین تک معیاری ادب کی ترسیل میں کامیاب ہیں؟

جواب: جدید ادب کے سلسلہ میں یہاں لفظ معیار کی جگہ مزاج لکھنا چاہوں گا۔ بہت سی نگارشات جو رسالہ کے عمومی مزاج کے برعکس ہوتی ہیں بعض اوقات میں نہیں چھاپ سکتا، وہ معیاری تو ہوتی

ہیں۔ بات رسالے کے مزاج کی ہے۔ مزاج میں سختی بھی اچھی بات نہیں سو بہت ساری اختلافی تحریریں بھی شامل کی جاتی ہیں لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ میں نے بعض ایسی تحریریں بھی چھاپ دی تھیں جو کہیں میرے ایک اصولی موقف سے تو میل کھاتی تھیں لیکن جو تہذیب و اخلاق کے میرے اپنے ہی کم از کم معیار سے کم تر تھیں۔ اب حال ہی میں اس کوتاہی کی کچھ تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔ سو مکمل طور پر اطمینان والی بات تو نہیں لیکن قدرے اطمینان والی بات ضرور ہے۔ ۲۰۰۹ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بھاول پور سے ایک طالبہ نے ''جدید ادب میں شائع ہونے والے مباحث'' کے عنوان کے تحت ایم اے کا تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ حال ہی میں وکی پیڈیا نے جدید ادب کا صفحہ بنا کر اس ادبی رسالہ کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے، ایسی علمی و ادبی پیش رفت سے خوشی ضرور ہوئی ہے، لیکن اطمینان کر کے بیٹھ جانے والی بات یہاں بھی نہیں ہے۔

جہاں تک دوسرے رسائل کے ذریعے معیاری ادب کی ترسیل کے سوال کا تعلق ہے تو یہ معاملہ ملا جلا ہے۔ بعض رسائل ایسا کر رہے ہیں، بعض رسائل نے کاروباری انداز اختیار کر لیا ہے۔ بیرون ملک بستیوں کے نام پر جو کچھ چھاپا جا رہا ہے اس کا بڑا حصہ ادب کے مرکزی دھارے میں کسی شمار میں نہیں آئے گا۔ لیکن اس کے لیے صرف ادبی رسائل کو ہی کیوں نشان زد کیا جائے۔ انڈو پاک میں لکھنے والوں کی ایک پوری کھیپ کاغذ قلم لے کر بیٹھی ہے کہ کب کوئی بیرونی بستی کا ''شاعر'' ہاتھ لگے اور وہ اس کی شان میں مضمون یا فن و شخصیت قسم کی کتاب تیار کر کے قیمت وصول کریں۔ ایک مثبت کام بہت زیادہ منفی ہو کر رہ گیا ہے۔

سوال نمبر۱۰: کیا کسی ادبی رسالہ کا مدیر ہونے کے لیے شاعر یا ادیب ہونا ضروری ہے؟

جواب: شاعر یا ادیب ہونا ضروری نہیں ہے لیکن ادب کی فہم ہونا بہت ضروری ہے۔ ویسے ماضی میں بھی ادب کی اعلیٰ درجہ کی فہم رکھنے والے مدیران نے تاریخی نوعیت کے ادبی جرائد نکال کر دکھائے اور اسی راہ پر چلتے چلتے خود بھی کچھ نہ کچھ لکھنے کی طرف مائل ہوئے۔ ان کا وہ سارا لکھا ہوا بھی ادبی طور پر اہمیت کا حامل ہے۔

سوال نمبر۱۱: ایک اہم رسالے کے مدیر کی حیثیت سے ہم عصر ادبی رسائل و جرائد کی صورتحال پر

آپ کے کیا تاثرات ہیں ۔مزید برآں آپ ہم عصر پاکستانی رسائل اور ہندوستانی رسائل میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب:ادبی رسائل اندھیرے میں چراغ جلا رہے ہیں۔اس میں مختلف نوعیت کے چراغ ہیں۔کچھ لوگ مٹی کے تیل سے،سرسوں کے تیل سے یا گھی سے چراغ جلا رہے ہیں۔کچھ لوگ خونِ جگر سے ادب کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔کچھ اور لوگ بھی خون سے چراغ جلائے ہوئے ہیں لیکن وہ دوسروں کے خون سے اپنے چراغ روشن کر رہے ہیں۔سو جو چراغ جس جگہ بھی ہے اپنی جگہ پر آفتاب ہے۔

پاکستانی اور ہندوستانی ادبی رسائل میں مجھے تو یہی فرق دکھائی دیتا ہے کہ پاکستانی رسائل میں پاکستانی لکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور انڈیا میں ہندوستانی لکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔باقی علمی و ادبی معیار تو تھوڑے بہت فرق کے ساتھ دونوں طرف ایک جیسا ہی ہے۔

تحریر کردہ:۲۱دسمبر ۲۰۱۱ء

(مطبوعہ **دستاویز** دوحہ، قطر۔شمارہ نمبر ۲۔سال اشاعت ۲۰۱۲ء)

تحقیقی سوالنامہ

برائے جملہ سرپرست و مدیران صاحبان اردو رسائل و جرائد

سوالات:سعید الرحمان (مردان) جواب:حیدر قریشی (جرمنی)

عنوان: اردو زبان میں شائع ہونے والے رسائل و جرائد کا جامع تعارف

گزارش: براہ کرم ہرسوال کے نیچے دیئے گئے خالی جگہ میں جواب تحریر یا کمپوز کروائیں اگر جواب دینے کے لئے متعلقہ جگہ ناکافی ہو تو اپنی جانب سے جگہ/صفحات کا اضافہ کر کے یا متعلقہ مواد الگ سے ارسال کر کے مشکور فرمائیں۔سوال نامہ کی طوالت کے لیے معذرت خواہ ہوں، سوالات اس لیے زیادہ شامل کیے ہیں تاکہ موضوع کے ہر گوشے پر ممکنہ معلومات اکٹھی کی جا سکیں۔تاہم جو سوال آپ سے غیر متعلق/ نامناسب ہو تو وہ بیشک خالی چھوڑ سکتے ہیں۔

جزاکم اللہ خیراً

سوال نمبر:1 آپ کے زیر ادارت وزیر نگرانی شائع ہونے والے رسالے، جریدے، صحیفے اور مجلّے کا پورا نام،نوعیت[سہ روزہ،ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامہ، دوماہی، سہ ماہی، ششماہی، سالنامہ، خبرنامہ، سلسلہ وار، کتابی سلسلہ وغیرہ] بمع مقام اشاعت؟

جواب: جدید ادب جرمنی سے آج کل ششماہی نکل رہا ہے۔خانپور کے زمانے میں دوماہی بھی نکلتا رہا ہے۔

سوال نمبر:2 رسالے کی کوئی خاص وجہ تسمیہ یعنی اس نام سے کیوں موسوم ہے؟

جواب: چونکہ جدید ادبی رجحانات میں دلچسپی تھی،اسی مناسبت سے رسالہ کا نام جدید ادب رکھ لیا۔

سوال نمبر:3 رسالے کے مؤسس/بانی کا نام اور جامع تعارف؟

جواب: میں نے ہی اس کا آغاز کیا تھا، جامع تعارف کے لیے کسی حد تک اس لنک سے کچھ کام چلایا جا سکتا ہے۔

http://en.wikipedia.org/wiki/Haider_Qureshi

اور

http://en.wikipedia.org/wiki/Jadeed_Adab

سوال نمبر:4 رسالے کا مختصر تاریخی پس منظر اور محرکات؟

جواب: میں خان پور ضلع رحیم یار خاں میں رہتا تھا۔تب ادبی رسائل بڑے شہروں سے نکلا کرتے تھے۔لاہور کے اہلِ ادب چھوٹے شہروں کے ٹیلنٹ کی طرف توجہ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔سو چھوٹے شہروں کی طرف سے ادب کے مرکزی دھارے میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے کتابی سلسلہ کی صورت میں جدید ادب کا اجرا کیا۔

سوال نمبر:5 رسالے کا پہلا شمارہ/پرچہ کب نکالا گیا یعنی کب سے مسلسل اشاعت کا سفر طے کر رہا ہے؟

جواب: اکتوبر ۱۹۷۸ء میں اس کا پہلا شمارہ شائع کیا گیا جو کتابی سائز کے ۸۰ صفحات پر مشتمل تھا۔تاہم اشاعت کے دوران وقفے آتے رہے۔

سوال نمبر:6 کیا درمیان میں کبھی کسی وجہ سے اشاعت کا سلسلہ ملتوی کرنا پڑا ہے؟

جواب: ۱۹۸۱ء تک تو ہر دو مہینے بعد رسالہ نکال لیتے تھے،لیکن پھر وسائل نہ ہونے کے باعث وقفہ وقفہ سے اسے شائع کرنا شروع کیا۔

پاکستان میں ۱۹۸۷ء تک رسالہ جیسے تیسے نکلتا رہا۔پھر بند ہو گیا۔جرمنی آنے کے بعد ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۰ء میں دو شمارے شائع کیے۔لیکن رسالے پر پوری کمانڈ نہ تھی،رسالہ پاکستان سے چھپتا تھا اور مقامی دوست اس میں بہت کچھ اپنی مرضی کا شامل کر لیتے تھے۔چنانچہ دو شماروں کے بعد اسے بند

کر دیا۔انٹرنیٹ پر ان پیج کی سہولت ملنے کے بعد پھر ۲۰۰۳ء میں اسے ششماہی رسالہ کے طور پر شائع کرنا شروع کیا۔تب سے اب تک رسالہ جاری ہے۔اس کے ۱۸ شمارے چھپ چکے ہیں۔۱۹واں شمارہ جو معمول سے ڈبل ضخیم ہو گیا ہے،اس وقت زیرِ اشاعت ہے۔یہ میرا جی نمبر ہے۔

سوال نمبر:7 اب تک رسالہ کے کتنے جلد اور شمارے بفضل اللہ شائع ہو چکے ہیں؟

جواب: خانپور کے دور میں ۱۷ شمارے، جرمنی میں پہلے دور میں دو شمارے،اور دوسرے دور میں اب تک ۱۹ شمارے چھپ چکے ہیں۔

سوال نمبر:8 رسالہ کے ناشر کا مختصر تعارف؟

جواب: کبھی پاکستان کے کسی دوست کے توسط سے اور کبھی انڈیا کے کسی دوست سے چھپوانے کے بعد اب زیادہ تر اسے ایجوکیشنل پبلشنگ

ہاؤس دہلی کے ذریعے شائع کرا رہا ہوں۔سو انہیں ناشر کہا جا سکتا ہے۔پاکستان سے شمارہ نمبر ۲، ۵ اور ۶ شائع کرائے تھے لیکن ایک تو اس کے اشاعتی نتائج زیادہ اطمینان بخش نہ تھے،دوسرے رسالے کی ترسیل میں بھی بہت ساری خرابیاں ہوئی تھیں۔سو اب ایجوکیشنل والوں کے اشاعتی معیار اور پروفیشنل کارکردگی سے کافی حد تک مطمئن ہوں۔

سوال نمبر:9 رسالہ جس مخصوص ادارہ کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے اس ادارے کا نام ومقام، جامع تعارف اور اہداف؟

جواب: پاکستان میں تو کسی ادارے کے زیر اہتمام شائع نہیں کرتا تھا۔لیکن جرمنی سے اسے ''سرور ادبی اکادمی جرمنی کے زیر اہتمام'' شائع کرتا ہوں۔اس ادارے کا نام اپنے والد مرحوم قریشی غلام سرور صاحب کی یاد میں انہیں کے نام پر رکھا ہے۔والد مرحوم کو یاد رکھنے کے سو بہانوں میں سے ایک بہانہ یہ بھی ہے۔یہی اس کا تعارف اور یہی میرے اہداف ہیں۔

سوال نمبر:10 کیارسالہ میں اردو کے علاوہ کسی اور زبان میں مضامین شائع ہوتے ہیں اوران کی اشاعت کے لیے علیحدہ سے کوئی سیکشن/حصہ ہے؟

جواب: عمومی طور پر اردو کے علاوہ کسی اور زبان کا میٹر چھاپنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔لیکن ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات پر تعزیتی گوشہ میں ان کے
بارے میں چند انگریزی مضامین بھی شامل کیے تھے۔اسی طرح زیر اشاعت میرا جی نمبر میں میرا جی کی نظموں کے چند تراجم انگریزی، عربی، جرمن، فارسی، روسی، اطالوی، ترکی، اور ڈچ زبانوں میں شامل کیے ہیں، ان سب کے لیے الگ سیکشن بنانا پڑا ہے۔

سوال نمبر:11 رسالے کے مدیر اعلیٰ/ چیف ایڈیٹر کا نام اور جامع تعارف؟

جواب: رسالہ کے ایڈیٹر سے لے کر چپراسی تک سب کچھ میں خود ہوں۔مزید جواب سوال نمبر ۳ کے جواب میں موجود ہے۔

سوال نمبر:12 رسالہ کے مجلس ادارت، مجلس منتظمہ اور مجلس مشاورت کا جامع تعارف؟

جواب: بعض مقامی دوستوں کو عمومی طور پر شامل رکھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں لیکن ادبی عدم تعاون کے باعث پھر ان کا نام ڈراپ کر دینا پڑتا ہے۔پہلے دور میں پروفیسر فرحت نواز صاحبہ آخر تک شریک مدیر رہیں۔موجودہ دور میں ڈاکٹر نذر خلیق ایک عرصہ تک اعزازی مدیر رہے۔
ڈاکٹر شفیق احمد اپنی تدریسی مصروفیات کے باعث وقت نہیں نکال پاتے، سواب ان کا نام بھی مشیر کے طور پر ڈراپ کر دیا ہے۔

سوال نمبر:13 عموماً رسالہ کے صفحات کتنے ہوتے ہیں؟

جواب: خانپور کے دور میں عام شمارہ ۸۰ صفحات کا ہوتا تھا، ۱۶۰، ۲۶۰ اور ۳۱۲ صفحات کے شمارے بھی شائع کیے گئے اور اُسی دور میں ۵۰۰ صفحات کا شمارہ بھی شائع کیا گیا۔موجودہ دور میں عموماً ۲۵۰ صفحات کے لگ بھگ شمارہ ہوتا ہے لیکن یہ (شمارہ نمبر۱۴) ۳۶۰ صفحات تک بھی چلا گیا

ہے۔جبکہ میرا جی نمبر ۵۵۰ صفحات سے بڑھ کر ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہو گیا ہے۔

سوال نمبر:14 کیا رسالہ میں باقاعدہ طور پر اداریہ لکھنے کا اہتمام کیا جاتا ہے؟

جواب: جی۔۔۔اداریہ ضرور لکھا جاتا ہے اور میں خود لکھتا ہوں۔

سوال نمبر:15 رسالہ کے "مستقل سلسلے" کون کون سے ہیں؟

جواب: ادبی رسائل کے معمول کے مطابق ہی سلسلے ہوتے ہیں۔ویسے جدید ادب میں ادیبوں کے گوشے بھی شائع کرتا ہوں۔ان گوشوں کو دیکھ کر بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کمرشیل قسم کے گوشوں سے بالکل مختلف نوعیت کے ہیں۔

سوال نمبر:16 رسالہ میں کس موضوع پر اور کس نوعیت کے مضامین اور تحریروں کو زیادہ اہمیت و وقعت دی جاتی ہے؟[علمی، تحقیقی، دعوتی وغیرہ]

جواب: ادب اور ادب سے جڑے ہوئے دوسرے موضوعات کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔مثلاً ''نظریۂ پاکستان۔ایک تاریخی مغالطہ اور موجودہ بحران''، ہماری تاریخ فہمی اور ہمارا فکری و سیاسی بحران'' سے لے کر ''محی الدین ابن العربی'' تک کے موضوعات زیرِ بحث رہے ہیں۔جدید ادب میں ادبی سرقات کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے۔اس حوالے سے متعدد شمارے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔شمارہ نمبر ۱۸، اس لحاظ سے اہم ترین ہے کہ اس میں سرقات کی نشاندہی کرنے والا ایک کردار پورے شواہد اور دلائل کے ساتھ خود زد پر آیا ہوا ہے اور اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا۔

سوال نمبر:17 کیا رسالہ میں "تبصرہ و تعارف کتب" کے سلسلے کا اہتمام کیا جاتا ہے؟

جواب: تبصرہ و تعارف کا سلسلہ مستقل طور پر ہے۔کتابوں پر مختصر تبصرے میں خود لکھتا ہوں اور

ان کی ایک خصوصیت تو بہر حال ہے کہ زیرِ تبصرہ کتاب کو سونگھ کر نہیں، پوری طرح پڑھنے کے بعد تبصرہ لکھتا ہوں۔

سوال نمبر:18 کیا رسالہ میں "مدیر کے نام " "یا کسی اور عنوان سے قارئین کے خطوط، سوالات، استفسارات و تاثرات شائع کئے جاتے ہیں؟

جواب: جی ہاں قارئین کے خطوط اور ای میلز کو مستقل طور پر شائع کیا جاتا ہے۔

سوال نمبر:19 رسالہ نے اب تک کسی خاص موقع یا موضوع کی مناسبت سے جو خاص نمبر/خصوصی شمارے نکالے ہیں ان کی تفصیل؟

جواب: پہلے دور میں ۱۹۸۵ء میں جدید ادب کا جوگندر پال نمبر شائع کیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان سے انڈیا کے کسی زندہ ادیب کے بارے میں یہ شاید پہلا نمبر تھا۔ اسی دور میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر جمیل جالبی، محمد علی صدیقی، جیلانی کامران، ممتاز مفتی اور دیگر کے گوشے بھی شائع کیے گئے۔ جرمنی سے رسالہ شروع کرنے کے بعد۔ اِس دور کے شماروں میں خاص نمبر تو ''میرا جی نمبر'' ہے جو اس وقت زیرِ اشاعت ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مختلف شماروں میں جوگندر پال، ڈاکٹر انور سدید، ہمت رائے شرما، ڈاکٹر رشید امجد، اکبر حمیدی،
عبداللہ جاوید، سلطان جمیل نسیم، ایوب خاور، احمد حسین مجاہد اور متعدد دیگر اہم لکھنے والوں کے گوشے، ڈاکٹر وزیر آغا کی دو طویل نظموں ''آدھی صدی کے بعد'' اور ''اک کتھا انوکھی'' کا گوشہ، حمایت علی شاعر کی کلیات کا گوشہ، ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی وفات پر ان کے تعزیتی گوشے، یہ سب کسی نہ کسی زاویے سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

سوال نمبر:20 کس خاص نمبر کو زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی اور کیوں؟

جواب سرقات کی نشان دہی والے شماروں کو کافی پذیرائی ملی، تاہم شمارہ نمبر ۱۸ کی پذیرائی سابقہ ہر شمارے سے بڑھ کر ہوئی۔

سوال نمبر:23 رسالہ میں مضمون شائع کروانے کے لیے قلمکاروں اور اہل علم کے لیے خصوصی ہدایات، گذارشات اور اصول وضوابط کیا ہیں؟

جواب: اب تو انٹرنیٹ کا زمانہ ہے، عام طور پر مطلوبہ میٹر بذریعہ ای میل ان پیج فائل میں ہی مل جاتا ہے۔ جو چیز رسالے کے مزاج کے مطابق ہوتی ہے، منتخب کر لی جاتی ہے، جو مزاج سے مختلف ہوتی ہے اس کے لکھنے والے سے معذرت کر لی جاتی ہے۔

سوال نمبر:24 کیا رسالہ کے شذرات اور نگارشات کی اشاعت میں حواشی و حوالہ جات ،مصادر و منابع ، مآخذ و مراجع کا اندراج کیا جاتا ہے؟

جواب: تحقیقی مضامین میں اسے ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

سوال نمبر:25

رسالہ کے سابقہ مدیران، اعلی مدیران، معاون مدیران اور دیگر نامور متعلقین کے نام؟

جواب: پروفیسر فرحت نواز، ڈاکٹر نذر خلیق، ڈاکٹر شفیق احمد، ۔۔ متعلقین: ارشد خالد، سعید شباب،

سوال نمبر:26 رسالہ کے نامور لکھاریوں/ اصحاب علم/قلمی معاونین (سابقہ/موجودہ) کے نام؟

جواب: **سابقہ دور میں:** ڈاکٹر سید عبداللہ، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، میرزا ادیب، حفیظ جالندھری، احسان دانش، ڈاکٹر وزیر آغا، جوگندر پال، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر جمیل جالبی، شمیم احمد، سید ضمیر جعفری، شیر افضل جعفری، ممتاز مفتی، اکبر حمیدی، رشید امجد، محسن احسان، منشا یاد، مظہر امام، شان الحق حقی، ایوب خاور، انوار احمد، سلیم کوثر، انور شعور، جابر علی سید، مرزا ظفر الحسن ، عبدالعزیز خالد، سجاد باقر رضوی، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، ضیا جالندھری، شہرت بخاری، اصغر ندیم سید، سعید شباب، حفیظ شاہد، فرحت نواز، اور متعدد دیگر۔

موجودہ دور میں: ڈاکٹر وزیر آغا، جوگندر پال، ڈاکٹر رشید امجد، انتظار حسین، منشا یاد، اکبر حمیدی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر شفیق احمد، مظہر امام، شاہد ماہلی، صبا

اکبرآبادی، بشریٰ رحمٰن، ترنم ریاض، ماہ پارہ صفدر، آفاق صدیقی، جواز جعفری، امین خیال، محمد عاصم بٹ، ناصر عباس نیر، ڈاکٹر نذر خلیق، ندا فاضلی، ڈاکٹر صدیق شبلی، سلیم آغا قزلباش، ناصر زیدی، صادق باجوہ، ڈاکٹر ریاض اکبر، علی احمد فاطمی، اسلوب احمد انصاری، احمد ہمیش، حمایت علی شاعر، سعادت سعید، ڈاکٹر بلند اقبال، اسلم رسولپوری، محمد علی صدیقی، تاجدار عادل، عبداللہ جاوید، سلطان جمیل نسیم، شہناز نبی، جان عالم، ڈاکٹر رضیہ اسماعیل، مظفر حنفی، نصرت ظہیر، قاضی سلیم الرحمٰن، کامران کاظمی، ڈاکٹر خلیل طوق آر، ڈاکٹر لڈمیلا وسیلیویا، ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ، ہانی السعید، موسیمو بون، گیتا پاٹیل، رضیہ فصیح احمد، پروین شیر، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر خلیق انجم۔شہزاد احمد، سید ضمیر جعفری، سید معین الرحمٰن، جیتندر بلو، کاوش عباسی، سید حسن جعفر زیدی، خادم علی ہاشمی، عبدالرب استاد، ڈاکٹر صبیحہ خورشید، حمیدہ معین رضوی، احمد حسین مجاہد، انور زاہدی، رؤف خیر، ساقی فاروقی، افتخار عارف، سحر انصاری، عامر سہیل، غالب احمد، کرامت علی کرامت، کلیم شہزاد، مرزا خلیل بیگ، دیوندر اسر، مبشر احمد میر، شمس الرحمٰن فاروقی، قیصر شمیم، شہناز خانم عابدی، نیر جہاں، خاور اعجاز، اعجاز راہی، قاضی اعجاز محور، شفیق انجم، امین بابر۔فہیم جوزی، اسلم انصاری، افضل چوہان، ڈاکٹر پرویز شہریار، ناصر علی سید، فرحت نواز، اختر رضا سلیمی، اسماعیل گوہر، ڈاکٹر پنہاں، ناصر نظامی، ارشد خالد، اور متعدد دیگر اہلِ قلم۔موجودہ دور میں یہ سہولت میسر ہے کہ صرف پاکستان اور انڈیا کے اردو لکھنے والے ہی نہیں، دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اردو لکھنے والوں سے رابطہ ہو جاتا ہے اور مطلوبہ میٹر نسبتاً آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے۔

سوال نمبر:27 ادبی و دینی مجلّاتی صحافت کے سفر میں آپ کے رسالے کی کوئی خاص کامیابی/کارنامہ؟

جواب: جدید ادب میں آزادانہ طور پر لکھے گئے مختلف فکری مسائل پر مضامین شائع کیے گئے ہیں تاہم دینی حوالے سے کوئی خصوصی کام نہیں کیا گیا۔

سوال نمبر:28 رسالے سے منسلک دیگر شعبہ جات جیسے مکتبہ/کتب خانہ، دارالتصنیف

وتالیف وغیرہ کا مختصر تعارف؟

جواب: جیسے رسالے کا ایڈیٹر سے چپراسی تک میں خود ہوں، ویسے ہی دیگر شعبہ جات کا بوجھ بھی میرے اپنے ہی سر پر ہے۔سرور ادبی اکادمی جرمنی کا لکھ چکا ہوں کہ والد مرحوم کے نام سے ادارہ قائم کیا ہے۔جو کتاب کسی اور ادارے کی جانب سے نہیں چھپواتا، اسے اسی ادارے کی طرف سے چھاپ لیتا ہوں۔اپنی لکھی ہوئی بیس سے زائد کتابوں کے دارالتصنیف کا مہتمم بھی میں آپ ہی ہوں۔

سوال نمبر:29 قارئین کی کل تعداد؟

جواب: اللہ بہتر جانتا ہے۔

سوال نمبر:30 کیا رسالہ انٹرنیٹ پر اپ لوڈ/مہیا کیا گیا ہے۔اگر جواب ''ہاں'' میں ہے تو کب سے اور کس ویب سائٹ پر upload کیا گیا ہے؟

جواب: www.jadeedadab.com

سوال نمبر:31 کیا رسالہ آپ کے ادارے کے ویب سائٹ پر اپ لوڈ کیا جاتا ہے یا اس کے لئے الگ سے کوئی خودمختار آفیشل ویب سائٹ ہے؟

جواب: ایک دوست نے اپنے طور پر یہ ویب سائٹ بنادی ہے۔اللہ اسے خوش رکھے۔

سوال نمبر:32 اگر رسالہ ایک سے زائد ویب سائٹس پر upload کیا جاتا ہے تو براہ کرم ان ویب سائٹس کے لنکس بھی فراہم کیجیے۔

جواب: میرے علم میں نہیں ہے۔

سوال نمبر:33 **اگر رسالہ یا اس کا کوئی فورم فیس بک، بلاگر، ٹوئٹر یا کسی اور سوشل نیٹ ورک کے ویب سائٹ پر دستیاب ہو تو ان کے لنکس؟**

جواب: ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔

سوال نمبر:34 **کیا رسالہ خواہش مند قارئین کو سافٹ شکل میں بذریعہ ای میل ارسال کیا جاتا ہے؟**

جواب: نیا شمارہ چھپنے پر اس کا لنک مختلف فورمز پر ریلیز کر دیا جاتا ہے۔

سوال نمبر:35 **اگر رسالہ انٹرنیٹ پر مہیا نہیں کیا گیا تو کیا اس حوالے سے مستقبل قریب میں کوئی ارادہ رکھتے ہیں؟**

جواب:

سوال نمبر:36 **علوم شرقیہ و اسلامیہ کی نشر و اشاعت اور ترویج میں آپ اپنے جریدہ کے کردار کے بارے میں کیا کہیں گے؟**

جواب: میری طرف سے کسی نوعیت کا دعویٰ کیا جانا مناسب نہیں ہے، اس کا فیصلہ اچھے قارئین اور محققین بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔

سوال نمبر:37 **عصر حاضر میں ادبی و دینی مجلّاتی صحافت سے وابستہ اداروں و افراد کے کردار کے حوالے سے آپ کے کیا تاثرات ہیں؟**

جواب: ادبی صحافت سے وابستہ افراد کے حوالے سے کہہ سکتا ہوں کہ جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے!

سوال نمبر:38 **ادبی و دینی مجلّاتی صحافت سے وابستہ اداروں وافراد کو کونسے وسائل دستیاب ہیں اور کن مسائل کا سامنا ہے؟**

جواب: پاکستان میں انتہائی تنگ دستی کے ماحول میں بھی رسالہ اپنی جیب سے شائع کرتا تھا اور یہاں جرمنی میں بھی اپنی جیب سے ہی رسالہ شائع کر رہا ہوں۔ نہ کبھی مدیران کے مسائل پر زیادہ غور کیا ہے اور نہ ہی ان کے حل کے لیے کچھ سوچا ہے۔ مجھے کسی نے نہیں کہا تھا کہ میں ادبی رسالہ جاری کروں۔ یہ میرا ذاتی شوق اور ذاتی مسئلہ ہے تو مجھے خود ہی اس کے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔

سوال نامہ کے پُر کنندہ کا نام: حیدر قریشی

عہدہ/رسالہ سے وابستگی [بطور]: ایڈیٹر جدید ادب جرمنی

تاریخ: **۲۹/جون ۲۰۱۲ء**

دستخط:

رسالے کی ادارت، نیابت، معاونت، مشاورت اور نظامت کے حوالے سے تفصیلی مصدقہ معلومات کی فراہمی کا بے حد شکریہ

سوال نامہ واپس ارسال کرنے کے لیے ای میل ایڈرس:

saeed@awkum.edu.pk

پوسٹل ایڈرس:

سعید الرحمان [لیکچرر و ریسرچ سکالر]، ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک سٹڈیز، عبدالولی خان یونیورسٹی، مین کیمپس مردان، پوسٹل کوڈ:23200،

خیبر پختونخواہ، پاکستان، موبائل نمبر:0313-9700523

رضینہ خان کے سوال
حیدر قریشی کے جواب

نوٹ: جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی سے رضینہ خان میری افسانہ نگاری کو موضوع بنا کر پروفیسر ڈاکٹر مظہر مہدی کی نگرانی میں ایم فل کا مقالہ لکھ رہی ہیں جو اَب تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔اپنے تحقیقی کام کے حوالے سے انہوں نے ۱۲ جون ۲۰۱۳ء۔۔۔ ۲۹ ستمبر ۲۰۱۳ء۔۔۔۔ ۷ جون ۲۰۱۴ء اور ۱۰ جون ۲۰۱۴ء کو ای میل کے ذریعے مختلف سوالات کیے۔آج **۱۰ جون ۲۰۱۴ء** کو یہاں وہ سوالات اور میری طرف سے انہیں جو جواب بھیجے گئے،سب یک جا کر رہا ہوں۔ان کے ایم فل کے مقالہ میں تو یہ باتیں حسبِ ضرورت شامل ہو سکیں گی،جبکہ یہاں یہ ساری باتیں مکمل طور پر ریکارڈ میں آ جائیں گی۔براہِ راست انٹرویو نہ ہوتے ہوئے بھی یہ سوالات اور ان کے جواب ایک غیر رسمی انٹرویو کی صورت اختیار کر گئے ہیں تو مناسب لگا کہ یہ انٹرویو شائع کرا لیا جائے۔رضینہ خان نے بھی اس کی اشاعت کے خیال سے اتفاق کیا ہے۔(ح۔ق۔)

رضینہ خان:

آپ اردو ادب کے ایک باشعور اور حساس تخلیق کار ہیں۔جو انسانی روح کی گہرائیوں میں اترنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔مرکب اور تہہ دار صورتحال پیدا کرنا جانتے ہیں۔اور سب سے بڑھ کے یہ کہ آپ کے پاس اظہار کی صلاحیت موجود ہے۔آپ نے اپنی زندگی سے جڑے معمولی سے

معمولی واقعات کو بہت ہی سچائی اور سادگی کے ساتھ غیر معمولی بنا کر قاری کے سامنے پیش کیا۔لیکن آپ نے اپنے پاکستان سے جرمنی منتقل ہونے کے اسباب کا کہیں بھی کھل کر ذکر نہیں کیا۔۲۰۰۵ء میں آپ نے عارف فرہاد صاحب کو دیئے اپنے ایک انٹرویو میں اس حوالے سے جو کہا میں اسے یہاں درج کر رہی ہوں۔

”**عارف فرہاد:** جرمنی آنے کا خیال کیسے آیا آپ کو؟

حیدر قریشی: آہ۔یہ لمبی کہانی ہے اور اس کے لئے ابھی مزید چھ مہینے انتظار کریں۔اس کے بعد میں جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔

عارف فرہاد: تو اب تک آپ نے جو انٹرویوز دئے ہیں ان میں جرمنی آنے کا واقع سچ تھا یا جھوٹ تھا؟

حیدر قریشی: نہیں جھوٹ کہیں نہیں بولا ہے۔یہ تو ہو سکتا ہے کہیں کسی مجبوری یا مصلحت کے تحت خاموشی اختیار کر لی ہو لیکن جھوٹ کہیں نہیں بولا اور ابھی میں ان باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا اور جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہتا بلکہ بعد میں دیا نتداری سے بتاؤں گا کیا صورت حال تھی اور کیا situation تھی۔“

سوال: میرے خیال سے آپ نے جو چھ مہینے کے مدت دی تھی اسے ختم ہوئے بہت وقت ہو گیا۔میرا ابھی آپ سے وہی سوال ہے کہ آپ کو جرمنی جانے کا خیال کیوں آیا؟ اس وقت ایسی کیا صورت حال تھیں جو آپ کو یہ فیصلہ لینا پڑا۔ان سیاسی اور سماجی صورت حال پر اگر آپ روشنی ڈال سکیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔

جواب: جرمنی جانے کے خیال میں ایک سے زائد عوامل شامل تھے۔ایک یہ کہ پاکستان میں میرے لیے کہیں بھی حالات سازگار نہیں تھے۔دوسرے یہ کہ میری اہلیہ تین بچوں کے ساتھ جرمنی جا چکی تھیں،تیسرے یہ کہ میرے افسانوں کے مجموعہ ”روشنی کی بشارت“ کی اشاعت کے بعد ایک

حلقے کی طرف سے کچھ مخالفانہ طرزِ عمل سامنے آیا تھا۔سوایسی صورتِ حال میں میرے لیے پاکستان سے نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔لیکن یہ سب کچھ میں چھپا نہیں رہا تھا۔ چھپانے والی بات،جس کی وجہ سے میں اظہارِ خیال سے گریز کر رہا تھا،اصلاً یہ تھی کہ مجھے پاکستان سے دہلی کے راستے سے ہو کر جرمنی جانا پڑا تھا۔دہلی میں یونائیٹڈ نیشنز کے ذیلی ادارے یواین ایچ سی آر نے میرے کیس کو سٹڈی کیا تھا۔اپنے ذرائع سے پاکستان میں ان حالات کی تصدیق کرائی تھی اور پھر مجھے اسائلم سیکر کے طور پر اپنے ہاں رجسٹر کرلیا تھا۔میں اپنے دو بیٹوں کے ساتھ سوا سال کے لگ بھگ دہلی میں مقیم رہا۔ہمارا قیام اور طعام سب اسی ادارہ کے ذمہ تھا۔یواین ایچ سی آر والے ہر تین مہینے کے بعد وزارت داخلہ ہند کے نام ایک لیٹر لکھتے تھے۔اس کی بنیاد پر ہمارے ہندوستان میں قیام کے ویزے میں مزید تین ماہ کی توسیع کر دی جاتی تھی۔میں سات کو روانہ ہو کر،آٹھ ستمبر ۱۹۹۲ء کو دہلی پہنچا تھا اور ۳۰ دسمبر ۱۹۹۳ء کو دہلی سے جرمنی روانہ ہو گیا تھا۔ہم تینوں باپ بیٹوں کو ویزا جرمن حکام نے دیا تھا اور ٹکٹ اقوام متحدہ کے اسی ذیلی ادارہ نے دیا تھا جن کے ایما پر ہم لوگ دہلی میں قیام پذیر تھے۔میں مذکورہ انٹرویو کے بعد اپنی بعض تحریروں میں اس بات کا ذکر کر چکا ہوں کہ مجھے جرمنی جانے سے پہلے کچھ عرصہ دہلی میں قیام کرنا پڑا تھا۔

سوال : کتاب ''منظر اور پس منظر'' کے دو کالم ''اختلافِ عقیدہ کی بنیاد پر نفرت کیوں؟'' اور ''ہماری اجتماعی غلطیاں'' میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کا اور آپ کا جرمنی جانے میں کیا کہیں سے کوئی لینک موجود ہے؟

جواب: دہلی میں یواین ایچ سی آر کا ریکارڈ بھی گواہ ہے اور یہاں جرمنی میں میرے اسائلم کے کاغذات کا ریکارڈ بھی گواہی دے گا کہ میں نے صرف ایک شاعر اور ادیب کے طور پر اپنا کیس پیش کیا تھا اور اسے اسی بنیاد پر قبول کیا گیا۔جرمنی پہنچنے اور وہاں مکمل قانونی تحفظات حاصل کرنے تک جتنے مراحل آئے میں نے کسی مسلک،کسی فرقہ اور کسی مذہب کا ذکر کر کے کوئی سہولت نہیں

مانگی۔میں اس بات کا آج بھی فخر یہ اظہار کر سکتا ہوں کہ میں نے کسی مسلک کا احسان لے کر یہاں تحفظ حاصل نہیں کیا۔صرف اپنے ادبی حوالے سے تحفظ حاصل کیا۔

جہاں تک میرے ان خیالات کا تعلق ہے جن کا آپ نے اپنے سوال میں ذکر کیا ہے،انہیں میں اپنا اصولی موقف سمجھتا ہوں۔یہ کسی کی حمایت یا کسی کی مخالفت کی بات نہیں ہے۔یہ ایک حساس مسئلہ کا سنجیدہ جائزہ ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ اصولی موقف کو سمجھنے سے گریز کرنے والے مقامی سطح پر بھی اور عالمی سطح پر بھی اپنے تکلیف دہ مسائل میں مزید دھنستے چلے جا رہے ہیں۔

سوال: گلاب شہزادہ ہی کیوں؟اس لیے کہ دونوں ہی خوبصورتی کی علامت ہیں،دونوں وقت کے ساتھ نمو پاتے ہیں،دونوں کی فطرت میں مختلف شیڈس پائے جاتے ہیں۔یا کوئی اور وجہ؟

جواب:۱۹۸۱ء میں جن دنوں میں یہ کہانی لکھی جانے والی تھی،تب میں نے پہلی بار کالا گلاب دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔میری کہانی میں ایٹمی جنگ کی تباہ کاری کا احساس دلانا تھا اور اس میں بڑی طاقتوں کی حرص و ہوس کو نمایاں کرنا تھا۔انسانیت کی خوبصورتی کو ظاہر کرنے کے لیے گلاب شہزادہ خود بخود آ گیا۔گلاب کا سرخ رنگ کی بجائے کالے رنگ میں سامنے آنا،شاید کسی حد تک یہ بتا رہا ہے کہ انسانیت کا بہایا جانے والا سرخ خون جم جانے کے بعد کالا ہو جائے گا۔یہ بات اب آپ کے سوال پر ذہن میں آئی ہے۔کہانی لکھتے وقت ذہن میں شعوری طور پر ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔بس کالا گلاب دیکھنے کی حیرانی تھی اور علامتی طور پر مجھے یہ اپنی کہانی کے لیے مناسب لگ رہا تھا۔پروفیسر جیلانی کامران صاحب نے میرے افسانوں پر اپنے مضمون میں اس کہانی کے ذکر میں لکھا تھا۔

''کہانی (گلاب شہزادے کی کہانی) میں گلاب کا پھول انسان کی ابدی حکمرانی کا سمبل ہے لیکن اس سمبل کو انسان کی ہوس اور نظام زیست کے جبر نے پامال کر رکھا ہے۔''

سوال : افسانہ میں جو ذیلی موضوعات پیش کیے گئے ہیں،ان میں فیملی کے جدید مسائل کو خاص

طور پر نظر میں رکھا گیا ہے۔اس کی کوئی خاص وجہ؟

جواب: گھروں کے نئے مسائل چونکہ موجود تھے اس لیے ان مسائل نے بھی اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے افسانے میں جگہ بنالی۔کہانی کتنی ہی علامتی کیوں نہ ہو اسے کسی نہ کسی طرح شروع ہو کر کسی نہ کسی ماحول سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنا ہوتا ہے۔اس کہانی میں ذیلی کہانیوں کے طور پر جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ سب میرے ارد گرد موجود تھا۔ارد گرد کا جتنا حصہ کہانی میں جذب ہو کر آسکتا تھا، آ گیا۔تاہم ان بیان کردہ مسائل کو خصوصی طور پر مسائل بنا کر پیش کرنا میرے پیش نظر نہیں تھا۔

سوال: افسانے میں دو عورتیں موجود ہیں۔ایک تو وہ جو گھوڑی بنی ہوئی ہے، دوسری وہ جو خاندانی منصوبہ بندی میں برابر کی شریک ہے۔سوال یہ ہے کہ آپ نے عورت کا کوئی خاص نظریہ پیش کرنا چاہا ہے یا یہ افسانے کی ضرورت تھی؟

جواب: عورت کا کوئی خاص نظریہ پیش کرنا کبھی بھی میرے پیش نظر نہیں رہا۔پہلے والے سوال کے جواب کو دہرانا پڑ رہا ہے۔گھروں کے مسائل موجود تھے۔۔۔کچھ میرے ارد گرد تھا، جس میں گھوڑی کی طرح جتی ہوئی عورت بھی تھی، اور خاندانی منصوبہ بندی میں شریک عورت بھی تھی۔ویسے آپ کو سچی بات بتاؤں، یہ منصوبہ بندی والا حصہ میری اور میری اہلیہ کی داستان ہے۔تب سات سال کے وقفہ کے بعد چوتھی اولاد اور میرا تیسرا بیٹا پیدا ہوا تھا۔البتہ کھنڈر سے کھوپڑی ملنے والی بات کا میری ذاتی جاب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ کہانی کا اپنا کیا دھرا ہے۔

سوال: آپ اپنی تخلیق کے ذریعے تبلیغ کا کام سرانجام دینا چاہتے ہیں۔کیا اس کی وجہ آپ کا فطرتاً مذہبی ہونا ہے؟

جواب: آپ کے اس سوال کے جواب میں پہلے تو یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے مسلک سے منسلک رہتے ہوئے بھی میں مذہب کو اس کے ظاہری روپ سے کہیں زیادہ اس کی روح کے

طور پر لیتا ہوں۔میرے نزدیک بیشتر مذاہب کی ظاہری صورت سے قطع نظر ان سب کی روح ایک ہے۔ہستیٔ باری تعالیٰ کا اقرار کرنا بنیادی بات ہے۔اب آگے ہر فرد کے اپنے اپنے ذوق و شوق اور اپنے اپنے ظرف کی بات ہے کہ وہ خدا کی جستجو کے سفر میں کس حد تک نکلتا ہے۔نکلتا بھی ہے یا نہیں؟۔تو مذہب کا روحانی پہلو جو خدا تعالیٰ کی جستجو سے عبارت ہے تقریباً تمام مذاہب میں مشترک ہے اور یہی میرے تھوڑا بہت مذہبی ہونے کا سبب ہے۔میں مذاہب کی ظاہری صورت کا بھی احترام کرتا ہوں لیکن میری توجہ مذہب کی خارجی/ظاہری صورت کے مقابلہ میں داخلی/روحانی پہلو کی طرف ہی رہتی ہے۔یہ فرق واضح رہے تو شاید میں فطرتاً مذہبی ہوں۔

میری تخلیقات میں اگر خدانخواستہ تبلیغی رنگ در آیا تو یہ میرے لیے بُری خبر ہوگی۔میرے افسانوں کے پہلے مجموعہ پر رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر فہیم اعظمی نے لکھا تھا۔

"حیدر قریشی الہامی قصص، اساطیر، ذاتی اور معاشرتی مسائل کو آپس میں مدغم کر کے ایک ایسا آئینہ تخلیق کرتے ہیں جس میں پیدائش سے موت تک زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔بیشتر کہانیوں میں میجر کردار خود کہانی کار کی ذات ہوتی ہے اور اس طرح **حیدر قریشی فلسفیانہ، مذہبی اور اخلاقی قدروں پر رائے بھی دیتے ہیں تو کسی غیر متعلق یا خارجی خیال آرائی کا احساس نہیں ہوتا اور سب کچھ کہانی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔کہیں کہیں مذہبی عقائد کا اظہار بھی ہوتا ہے مگر جمالیاتی طور پر ان میں نہ کوئی خطابیت پیدا ہوتی ہے اور نہ کسی آئیڈیل یا انفرنل دنیا میں داخل ہونے کی ترغیب ہوتی ہے۔''**

ڈاکٹر فہیم اعظمی نے مجھے ''تبلیغ'' کے الزام سے بری کیا تھا اور مجھے ان کی رائے سے دلی خوشی ہوئی تھی۔یہاں مزید وضاحت کے طور پر ۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۶ء کے دو مختلف انٹرویوز میں کہی گئی اپنی باتیں دہرا دینا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ میرا موقف پورے تناظر میں سامنے رہ سکے۔

سوال نمبر ۸: کس مکتبۂ فکر سے آپ کی شاعری متاثر ہے، کیا ادب اور شاعری کو نظریاتی ہونا چاہیے؟ آپ کس نظریے کے تحت شعر کہتے ہیں؟

جواب: میں با قاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ کسی بھی نظریے کے تحت شعر نہیں کہتا اور نہ ہی ایسی شاعری کو اچھی شاعری سمجھتا ہوں جو پہلے نظریے کی پابندی کرائے اور پھر اس کے مطابق شاعری کرائے۔ ہر شاعر زندگی کے مختلف نظریات میں سے کسی نہ کسی کا معترف ضرور ہوتا ہے سو اس کا نظریہ اس کی روح کا جُزو بن کر جب اس کے اندر سے آتا ہے تو اعلیٰ فن پارہ بن جاتا ہے لیکن جب محض کسی عقیدے کا اظہار مقصود ہو اور شاعری ثانوی حیثیت اختیار کر جائے تب پراپیگنڈا شاعری تو وجود میں آجاتی ہے اچھی شاعری نہیں۔ آپ اردو ادب میں ہندو مسلم اور سکھ ادیبوں کے بڑے نام دیکھ لیں مختلف عقائد اور نظریات کے باوجود ان سب نے بڑا ادب تخلیق کیا ہے کوئی ادیب کسی بھی نظریہ کو ماننے والا ہو، لمحہء تخلیق میں وہ اپنے باہر سے آزاد ہو کر اپنے اندر کی آواز پر لکھتا ہے تو اس کے اندر کے نظریے سے اپنے اختلاف کے باوجود میں اسے بڑا ادیب سمجھوں گا۔ میں نے جتنے مختلف قسم کے ادبی نظریات کو پڑھا ہے ان کے کچھ نہ کچھ اثرات تو ضرور مرتسم ہوئے ہیں میں نے ایک مزدور اور محنت کش کی زندگی گزاری ہے اس کے اثرات بھی ہیں۔ روحانیت سے مجھے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے سو تصوف کے اثرات بھی ہیں لیکن میرے نزدیک بنیادی اہمیت اندر کی آواز کو حاصل ہے۔

(سلطانہ مہر کی کتاب ''**سخنور**'' کے لیے ان کے بیس سوالوں کے جواب۔
تحریر کردہ: ۲۰ ستمبر ۱۹۹۵ء۔)

....

سوال: تخلیقی عمل اور مقصدیت کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تخلیق کار کے لئے لکھتے وقت کسی مقصد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے؟

جواب: جن لوگوں نے ادب کو حصول مقصد کا ذریعہ بنایا وہ بائیں بازو کے تھے یا دائیں بازو کے تھے۔ انہوں نے ادب کی جگہ پمفلٹ پیش کیا۔ ہر فنکار کا کوئی نہ کوئی نظریہ یا تصور ضرور ہوتا ہے سو

جب اس کا نظریہ اس کے باطن کی آواز بن کر آتا ہے تو اعلیٰ فن پارہ بن جاتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے باطن کی آواز پر دھیان دیئے بغیر خارجی سطح پر اپنے نظریات کا پرچار شروع کرتا ہے تو صرف پروپیگنڈہ ادب کو وجود میں لاتا ہے۔ اقبال اور فیض دو انتہاؤں کے نظریات رکھنے والے شاعر تھے لیکن دونوں نے زیادہ تر اپنے باطن کی آواز پر لکھا اس لئے وہ اعلیٰ شاعر تھے۔ سو میرے نزدیک تخلیقی عمل کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے۔ البتہ اس سے کسی مقصد کی ترجمانی بھی ہوتی ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسے ایک مثال سے یوں سمجھ لیں کہ ہوا کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ ہر ذی روح کو اس کی مطلوبہ گیس فراہم کرے۔ اگر ہوا سے یہ مقصد بھی حاصل ہو رہا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہی معاملہ ادب اور مقصدیت کا ہے۔

(**حیدر قریشی سے انٹرویو از ثریا شہاب۔** مطبوعہ روزنامہ **جنگ لندن**۔ شمارہ ۷/نومبر ۱۹۹۶ء۔
ادبی صفحہ ''جہانِ ادب'')

....

سوال: آپ کی کون سی تصنیف پاکستان میں شائع ہوئی اور کون سی جرمنی میں اس حوالے سے آپ نے جواز جعفری کو دیئے گئے تحریری انٹرویو میں لکھا تھا کہ۔

''عمرِ گریزاں'' کی ساری شاعری، میری محبتیں کے (ایک کو چھوڑ کر) سارے خاکے، عہد ساز شخصیت کے مضامین، دو کو چھوڑ کر باقی سارے انشائیے اور قصے کہانیاں کے بارہ میں سے ۶ افسانے نہ صرف پاکستان کے زمانے میں لکھے جا چکے تھے بلکہ مختلف ادبی رسائل میں یہ ساری تحریریں چھپ بھی چکی تھیں۔ دو شعری مجموعے، ماہیے پر تحقیقی و تنقیدی کتب، سفر نامہ اور یادیں، یہ خالصتاً جرمنی میں آنے کے بعد ہوئے ہیں''۔

(شباب، سعید، انٹرویوز (مرتب)، ہالینڈ: نظام آرٹ اکیڈمی، ۲۰۰۴ء، ص ۸۸-۸۹)

سوال ۱۔ اس انٹرویو کی روشنی میں اگر انہیں الگ کر کے دیکھیں تو کیا یوں لکھا جائیگا؟

جرمنی آنے سے پہلے

پاکستان میں شائع ہونے والی تصانیف:

۱۔ کرنیں (بھاول پورڈویژن کے شعراء)

۲۔ سرائیکی غزل

۳۔ شفیق رنگ (ضلع رحیم یارخان کے شعراء)

۴۔ پہلا ورق

۵۔ سلگتے خواب (غزلیں)

۶۔ روشنی کی بشارت (افسانے)

۷۔ عمرگریزاں (غزلیں، نظمیں اور ماہیے)

۸۔ میری محبتیں (خاکے)

جرمنی میں شائع ہونے والی تصانیف:

۱۔ دعائے دل (غزلیں، نظمیں)

۲۔ محبت کے پھول (ماہیے)

۳۔ سوئے حجاز (سفرنامہ)

۴۔ کھٹی میٹھی یادیں (یادنگاری)

جواب: آپ نے پاکستان سے شائع ہونے والی کتابوں کی جو لسٹ دی ہے، ان میں سے پہلی ۶ کتابیں پاکستان کے زمانہ میں ہی شائع ہوگئی تھیں۔ ''عمرِ گریزاں'' (۱۹۹۶ء) اور ''میری محبتیں'' (۱۹۹۵ء) کتابیں شائع تو جرمنی پہنچنے کے بعد ہوئی ہیں لیکن یہ ساری تخلیقات رسائل و جرائد میں پہلے سے چھپ چکی تھیں۔ سوائے ایک آدھ تخلیق کے۔۔۔۔آپ نے **جرمنی میں** شائع ہونے والی تصانیف کی فہرست بنائی ہے لیکن میرا خیال ہے اس کا عنوان **جرمنی میں شائع ہونے والی** کی

بجائے **جرمنی آنے کے بعد شائع ہونے والی تصانیف** کیا جانا چاہیے۔ جرمنی آنے کے بعد بھی میری کتابیں پاکستان اور انڈیا ہی سے شائع ہوتی رہی ہیں۔

سوال: قصے کہانیاں کے ان ۶ افسانوں کے نام کیا ہیں جو پاکستان میں لکھے؟

جواب: کاکروچ، روشن نقطہ، دو کہانیوں کی ایک کہانی، شناخت، ۲۷۵۰ سال بعد، انکل انیس اور بابا جمالی شاہ کا جلال۔ یہ چھ افسانے نہ صرف پاکستان میں لکھے گئے بلکہ تب ہی وہیں کے رسائل میں شائع بھی ہوگئے تھے۔

سوال: ماہنامہ رسائل (اوراق، ماہِ نو، تخلیق، نگارستان، ادبِ لطیف، تجدیدِ نو، صدرنگ، جدید ادب کے علاوہ ابھی تک اور کسی رسائل میں بھی آپکی تحریریں شائع ہورہی ہیں اس کا نام کیا ہے؟

جواب: رسائل تو بہت سارے ہیں جن میں میری تخلیقات شائع ہوچکی ہیں۔ چند نام جو یاد آتے جاتے ہیں لکھ رہا ہوں لیکن یہ بہر حال نامکمل فہرست ہوگی۔ نیا دور۔کراچی، سیپ۔کراچی، کولاژ۔کراچی، عکاس انٹرنیشنل۔اسلام آباد، نیرنگِ خیال۔راولپنڈی، شاعر۔بمبئی، گلبن۔احمد آباد، شم لکھنو، توازن۔مالیگاؤں، ادب ساز۔دہلی، اسباق۔پونہ، اثبات۔تھانے، نردبان۔سرگودھا، اردو زبان۔سرگودھا، کتاب نما۔دہلی، ایوانِ اردو۔دہلی، انشاء۔کلکتہ، محفل۔لاہور، صریر۔کراچی، نگارِ پاکستان۔کراچی، نئی قدریں۔حیدرآباد، علامت۔لاہور، غنیمت۔لاہور، سبقِ اردو۔بھدوہی، شعروسخن۔مانسہرہ، الفاظ۔کراچی، ارتکاز۔کراچی، جدید اسلوب۔سہسرام، دستک۔ہوڑہ، مفاہیم۔گیا، خیابان۔راولپنڈی، استعارہ۔دہلی، شمع۔دہلی، بیسویں صدی۔دہلی، ان کے علاوہ اسلام آباد، خیرپور میرس (سندھ) اور کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے جرنلز میں میرے مضامین شائع ہوچکے ہیں۔ جامعہ دہلی کے ''تدریس نامہ'' میں بھی ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں بہت سارے رسائل کے نام ابھی بھول رہا ہوں۔ اخبارات کی فہرست الگ سے ہے اور خاصی طویل بھی۔

سوال: آپ کی زندگی کا ایک سال (۱۳/ جنوری ۲۰۰۳ء سے ۱۳/ جنوری ۲۰۰۴ تک) کافی اہمیت رکھتا ہے۔اس ایک سال میں آپ نے ۳ غزلیں اور ۳ نظمیں بھی لکھیں ان کے عنوان کیا تھے؟

جواب: اب غزلوں کا تعین کرنا تو شاید مشکل ہے،البتہ نظموں کے معاملہ میں مجھے لگتا ہے کہ یہ ۳ نظمیں لکھی گئی تھیں۔چلواک نظم لکھتے ہیں۔۔۔محبت کا ایک یادگار دن۔۔۔۔مبارک باد اور پُرسہ

سوال: کتاب حیدر قریشی کی ادبی خدمات (مرتب) پروفیسر نذر خلیق کب اور کہاں سے شائع ہوئی برائے مہربانی اس کتاب کی تفصیل بتائے۔

جواب: سال اشاعت:۔۔۔۔۔۔۔۲۰۰۳ء۔میاں محمد بخش پبلشرز۔محلّہ رحیم آباد خان پور
یہ کتاب اس لنک سے ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے۔اور اس کے صفحہ نمبر ایک اور دو پر پوری تفصیل موجود ہے

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/2014/05/blog-post_4276.html

سوال: ''حیدر قریشی کی ایک واضح خصوصیت تو مجھے یہ نظر آتی ہے کہ ان کے یہاں غیر ارادی طور پر جدید امریکی ''تخلیقی تحریروں'' کے دبستان کی پرچھائیاں موجود ہیں۔ممکن ہے قریشی صاحب خود مجھ سے متفق نہ ہوں۔لیکن میرے تاثر کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر مکالماتی تحریروں میں وہ ڈیوڈ لاج یا اُن کے رفقاء کے انداز کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ہمارے کہانی کاروں میں یہ انداز تاحال مفقود ہے۔خیر تو کہنا یہ ہے کہ حیدر قریشی کا مخصوص مکالماتی انداز جسے انگریزی میں Monologue کے ڈھنگ پر واحد متکلم بیشتر اوقات استفہامیوں کی صورت میں پیش کرتا ہے،ڈیوڈ لاج ہی نہیں بلکہ بے جادہ و منزل نسل Biat Generation کے دائروں سے بھی ٹکراتا دکھائی دیتا ہے۔حیدر قریش کا مخصوص مکالماتی انداز جسے انگریزی میں مونولاگ کے ڈھنگ پر واحد متکلم بیشتر اوقات استفہامیوں کی صورت میں پیش کرتا ہے۔''

اس اقتباس کو میں نے اپنے مقالہ میں شامل کیا ہے جس کا مکمل حوالہ مجھے نہیں مل سکا۔

جواب: قیصر تمکین صاحب کے یہ تاثرات ڈاکٹر نذر خلیق صاحب کی کتاب''۔۔۔۔ادبی خدمات'' میں ص ۲۰۰، ۲۰۱ پر شامل ہیں۔اس سے پہلے یہ تاثرات ویکلی **راوی** بریڈفورڈ کے نئے میلنئم اور نئی صدی کے آغاز پر نکالے گئے خاص نمبر میں شائع ہوئے تھے۔مجھے حتمی تاریخ تو یاد نہیں لیکن جنوری کے مہینہ میں ہی ضخیم خاص نمبر شائع ہوا تھا۔آپ میرا یہ جواب اس حوالے سے شائع کر سکتی ہیں۔

سوال: ۳ ماہ کے لئے آپ نے گوجرانولہ میں بھی ملازمت کی تھی یہ کس وقت کی بات ہے؟

جواب: حافظہ پوری طرح ساتھ نہیں دے رہا۔اندازے سے کہہ سکتا ہوں کہ ۱۹۸۶ء یا ۱۹۸۷ء کی بات ہے۔

سوال: آپ نے ۱۹۷۱ میں شاعری کے ذریعہ اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور پھر ۱۹۷۸ میں افسانہ (اندھی روشنی) تحریر کیا۔افسانہ لکھنے کی تحریک آپ کو اپنے اندر سے ملی لیکن کیا ایسی کوئی خاص وجہ سامنے آئی جب آپ کو ایسا محسوس ہوا کہ شاعری سے بات نہیں بن رہی؟

جواب: کسی دوسری صنف میں اظہار کا یہ مطلب نہیں کہ پہلی صنف میں بات نہیں بن رہی۔اصناف تو اظہار کا پیمانہ ہیں،بس یہ از خود ہو جاتا ہے کہ یہ بات شاعری میں کہنی ہے،افسانے میں کہنی ہے یا کسی اور صنف میں۔

یہ مختلف تخلیق کاروں کے اپنی اپنی ذات کے حوالے سے معاملات ہیں۔بعض صرف ایک صنف میں ہی اپنا اظہار کر لیتے ہیں،بعض کو ایک سے زیادہ اصناف میں جا کر زیادہ تخلیقی آسودگی نصیب ہوتی ہے۔میں کاشتکاری کے حوالے سے ایک مثال پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں۔بعض زمینیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں صرف ایک ہی فصل کاشت کی جاسکتی ہے،جبکہ بعض زمینیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں ایک سے زیادہ فصلیں کاشت کی جاسکتی ہیں۔

تخلیق کاروں کا معاملہ بھی کچھ اس سے ملتا جلتا ہی سمجھیں۔میری تخلیقات کو اسی تناظر میں دیکھا جائے تو شاید تفہیم میں مشکل پیش نہیں آئے گی۔

سوال: آپ نے اپنے افسانوں میں خوبصورت عورت کو استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔کوئی خاص وجہ؟

جواب: عورت کے کئی روپ ہیں جو میرے افسانوں میں آئے ہیں۔ان میں ماں، بہن، بیوی، بیٹی تک کے رشتے موجود ہیں۔انتہائی مظلوم عورت (شناخت) کا کردار بھی موجود ہے۔گویا دیگر کئی روپ میں عورت موجود ہے۔مقدس رشتوں میں بھی یہ روپ خوبصورت ہی ہیں۔بلکہ یاد آیا مجھے کتابی چہرے اس لیے اچھے لگتے ہیں کہ میری والدہ کا چہرہ کتابی تھا اور میری اہلیہ بھی ان کی بھتیجی ہونے کی وجہ سے ان سے مشابہت رکھتی ہیں۔سو میرے لیے عورت کی خوبصورتی کا محور میری ماں اور انہیں کے حوالے سے میری بیوی ہیں۔اب اس بات کو دوسری سطح پر بھی دیکھ لیتے ہیں۔خوبصورت عورت کا ذکر خوبصورت ہی لگتا ہے۔تاہم میرے ایک افسانے (آپ بیتی) میں میری ''ایک بہت اچھی دوست'' کا ذکر ہے۔دراصل اسے کچھ تنگ کرنے کے لیے بھی میں نے ایک بار دانستہ ایک بہت خوبصورت لڑکی کا ذکر کیا تھا۔اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اُس اچھی دوست نے جب بھی اس لڑکی کا ذکر کیا ہمیشہ کچھ یوں کہا ''آپ کے افسانے کی ہیروئن کا کیا حال ہے؟''۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ''اچھی دوست'' اُس ہیروئن سے زیادہ خوبصورت تھی (ہے)۔اور دونوں ہی کتابی چہرے والیاں تھیں۔

سوال: آپ مستقبل میں دو کام کرنے کی خواہش رکھتے ہیں ایک یہ کہ درجہ دوم کا شہری (ناول) لکھنا دوسرے ابنِ صفی پر کام کرنا۔سوال یہ ہے کہ کیا ان دونوں میں سے کسی پر آپ قلم اُٹھا چکے ہیں؟

جواب: انسان بہت سارے کام کرنے کے ارادے کرتا ہے لیکن معاملہ توفیق ملنے پر آ ٹھہرتا

ہے۔ابنِ صفی پر کام کرنا چاہتا تھا۔اس کے لیے کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ پیدا ہوا۔ایک دو متعلقہ احباب نے اس کا ذمہ لیا لیکن عملاً کچھ نہ ہوا۔سو یوں یہ معاملہ رُکا رہا۔البتہ اس دوران متعدد نئے پرانے لکھنے والے ابنِ صفی پر کام کرنے لگے اور ابن صفی کے کام کی اہمیت کو ادبی سطح پر بھی تسلیم کیا جانے لگا۔میری خواہش کے باوجود جو توفیق مجھے نہیں مل سکی، وہ بعض دوسرے لکھنے والوں کو مل گئی۔مجھے اس کی خوشی ہے۔

ناول کا معاملہ یوں ہے کہ اسے لکھنے کے لیے ایک باب شروع کیا تھا۔پھر یہ کام بھی رُک گیا۔دراصل دوسرے ادبی کام درمیان میں آجاتے ہیں اور یہ اہم کام زیادہ اہمیت کی وجہ سے تاخیر میں جا پڑتا ہے۔اس وقت بھی صورتِ حال یہ ہے کہ ستمبر،اکتوبر۲۰۱۴ء تک میری کتاب ''ہمارا ادبی منظر نامہ'' شائع ہو رہی ہے۔یہ ویسے تو میرے تنقید کے چھ مجموعوں کا مجموعہ ہے، لیکن اس میں شامل تازہ اور غیر مطبوعہ مجموعہ ''مضامین اور تبصرے'' اپنے بعض مندرجات کی وجہ سے اختلافی بحث کا باعث بن سکتا ہے۔پھر بعض پہلی کتابوں میں بھی میں نے نئے اضافے کئے ہیں۔ان پر بھی اختلافی بحث کی خاصی گنجائش ہے۔۹۹۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا ''اختتامیہ'' تھوڑا سا طویل ہے اور اس میں ہمارے عمومی ادبی منظر نامہ کو سامنے لایا گیا ہے۔مجھے لگتا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ادبی ہنگامہ ہو سکتا ہے۔ایسا ہوا تو پھر شاید میری باقی زندگی اعتراضات کے جواب میں اپنا موقف مزید واضح کرتے کرتے ہی گزر جائے گی۔اور ناول کا ارادہ بھی پورا نہ ہو سکے گا۔اگر ''ہمارا ادبی منظر نامہ'' کی اشاعت کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا تو مجھے ناول لکھنے کا موقع مل سکتا ہے۔**وماتوفیقی الاباللہ!**